حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد اردو زبان کی ایک لاکھ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ۔ از خواجہ حسن نظامی دہلوی

شمس العلما خواجہ حسن نظامی دہلوی کی لکھی ہوئی

رات کے وقت سنانے کی

جگ بیتی کہانیاں

(۱) اگا ما خاتون کی کہانی (۲) شاہ زادے کی کہانی (۳) جاذب کاغذ کی کہانی
(۴) انگلی کی کہانی (۵) شامی ابدال کی کہانی (۶) آنسو کی کہانی
(۷) فرنیچر مرچنٹ کی کہانی (۸) روح کے خول کی کہانی (۹) ہتھکڑی کی کہانی
(۱۰) دہلی کی شہزادی کی کہانی (۱۱) بھولی بیگم کی کہانی

کل گیارہ کہانیاں چوتھی بار بمقام حیدرآباد دکن مئی ۱۹۴۹ء میں چھپ کر
(شایع ہوئیں)

طبع چہارم

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

دیباچہ طبع دوم

جگ بیتی کہانیاں فروری سنہ ۱۹۱۸ء میں پہلی بار بصورت کتاب شایع ہوئی تھیں۔ اب اگست سنہ ۱۹۲۰ء میں ان کا دوسرا ایڈیشن چھاپا جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں سے دو قصے علیحدہ بصورت پمفلٹ منیجر صاحب نظامیہ دارالاشاعت نے بھی عرصہ ہوا چھاپے تھے جن میں سے ایک کا نام "گاما خاتون کی داستان" اور دوسرے کا نام "پیاری ہتھکڑی" تھا مگر اس مجموعے میں سنہ ۱۹۱۸ء سے پہلے کے تمام قصے جمع کیے گئے ہیں اور ان میں گاما خاتون کی داستان اور پیاری ہتھکڑی بھی ہے۔

سنہ ۱۹۱۸ء کے بعد اور جس قدر قصے میں نے لکھے ہیں وہ غالباً کارکن صاحب خواجہ بک ڈپو دہلی کسی دوسرے مجموعے میں شایع کرینگے۔ جگ بیتی کہانیوں میں اخلاقی نصیحت و عبرت کا بہت سامان ہے اور اسی نیت سے یہ قصے لکھے گئے تھے ان میں بعض تو بالکل فرضی ہیں اور بعض میں واقعات صحیح ہیں جو قصے کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے شریف گھرانوں میں ان قصوں کے پڑھنے اور سننے کا رواج بڑھتا جاتا ہے تاہم ابھی دیو پری کے قصوں سے زیادہ ان کی مقبولیت نہیں ہوئی۔ خدا تعالیٰ کے فضل سے امید ہے کہ وہ ان میں اثر دیگا اور ان کے ذریعے سے ہندوستانی لوگوں کا اخلاق کی اصلاح ہوگی۔

۱۲ اگست سنہ ۱۹۲۰ء

دیباچہ طبع سوم

پورے دو برس کے بعد ان کہانیوں کی تیسری اشاعت کا وقت آیا۔ اتنا عرصہ محض اس وجہ سے ہوا کہ کاغذ اور چھپائی طبع دوم کی اچھی نہ تھی اور غلطیاں کتابت کی بھی رہ گئی تھیں جن کو اب طبع سوم کے وقت درست کر دیا گیا اور کاغذ بھی عمدہ لگایا گیا ہے۔ یہ کہانیاں آخری چھپائی کے عرصہ میں زیادہ مقبول ہوئیں اور اسکول کی لڑکیوں میں ان کا رواج ہونے لگا ورنہ ڈیڑھ برس میں تو انکی بکری بہت کم رہی۔ خدا نے چاہا تو جوں جوں عورتوں کی تعلیم ترقی کرتی گئی [illegible] اور [illegible] کہانیوں کی قدر بڑھتی جائے گی۔ آخر کی تین کہانیاں لاجواب مانی گئی ہیں۔ "پیاری ہتھکڑی" قصہ گوئی [illegible] اور [illegible] نکالنے کے لحاظ سے پسند کیجاتی ہے اور "دکھیا شہزادی" اودھ کی بیگم کی کہانیاں درد [illegible] ہونے کی وجہ سے، حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی فرمایا کرتے تھے کہ

ولولہ قومی خاک میں مل جائیگا۔ بلا سے چند پیسے جل جاتے ہیں اور مال کا نقصان ہوتا ہے دلیری کا جذبہ تو قائم رہتا ہے۔

پہلے شخص نے کہا۔ سلام ہے آپ کے جنگی جوش کو۔ اسمیں کلام ہے کہ جنگی جوش ہے، مگر پھونک تماشہ اور ہزاروں مشغلے ہیں جن سے قومی حرارت زندہ رہ سکتی ہے، کیا آتش بازی پر اس کا حصر رہ گیا ہے۔ ورزش کے بہتر سے طریقے ہمارے بزرگوں کے ہیں جن میں لڑائی کی ادا پائی جاتی ہے اس کا شغل ہو تو ہاتھ پاؤں میں جان بھی آئے لڑائی کا جذبہ بھی قائم رہے۔ اور مال کا نقصان بھی نہ ہو۔ قرآن شریف میں آیا ہے کہ شیطان نے ان کے کاموں کو زینت دیکر ان کے سامنے پیش کیا ہے تو بس ایسا ہی آپ کا یہ خیال ہے تو بہ کیجئے اسراف بہت بری چیز ہے اور اسراف بھی ایسا کہ گناہ بے لذت۔ تھوڑی دیر کی بہار کے لئے جان و مال کو تباہ کرنا کس عقلمند نے بتایا ہے۔

گنگا ماپر اس بچے کی فرقت کا ایسا صدمہ ہوا کہ وہ اکثر خاموش رہنے لگی اور اسی طرح گھلتے گھلتے چند روز کے بعد مر گئی۔

جس دن گنگا ماخاتون کا انتقال ہوا ہے میں ریاست میں موجود تھا۔ نواب صاحب اس وقت کھڑے تھے کہ گنگا ما کی خبر وفات آئی۔ سنتے ہی غش کھا کر گر پڑے اور پھر وہ بھی زیادہ زندہ نہ رہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں گنگا ما کے فراق نے انکا بھی کام تمام کر دیا۔ اسطرح شب برات کی آتش بازی کی بدولت تین قیمتی جانوں کا خاتمہ ہوا۔

دہلی کے شہزادے کی کہانی

...چاہو۔ موتی پرجان دو۔ سونے چاندی کو سرمایہ زندگی سمجھو۔ شال دوشالے سے جی لگاؤ۔ ہاتھی گھوڑے۔ پالکی نالکی۔ محل حویلی کو ضروری خیال کرو

تم کو مبارک مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان مٹنے والی چیزوں کو دو کوڑی کا سمجھتے ہیں اور آخرت کی نعمتوں کے آگے دنیا کی ان بہاروں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ خدا اپنی محبت جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اس میں غریب امیر بڑے چھوٹے کمین شریف کی قید نہیں۔

دلی کا قلعہ آباد تھا۔ تیموری بادشاہ زندہ تھے اس وقت کا ذکر ہے۔ بہادر شاہ کے عزیزوں میں ایک شہزادے کو اللہ اللہ کرنے کی لگن لگ گئی۔ گھر میں خدا کے لونڈی غلام۔ نوکر چاکر ہاتھی۔ گھوڑے سب کچھ دیا تھا مگر یہ اللہ کا بندہ سب سے الگ مکان کے ایک کونے میں پڑا رہتا دو جو کی روٹیاں جس وقت دو اس وقت کھاتا مٹی کے آبخورے میں پانی پیتا اور یاد حق میں مصروف ہو جاتا۔ البتہ صاف کپڑے کا اور عطر کا بہت شوق تھا۔ ایک صندوقچے میں طرح طرح کے عطر بھرے رکھے رہتے تھے جن سے ہر نماز کے وقت ایک نئے عطر سے کپڑے بساتے اور خدا کے سامنے معطر ہو کر ہاتھ باندھتے۔

دنیا میں ان کو اولاد سے۔ مال سے۔ کنبہ سے رشتہ سے محبت نہ تھی بس دو چیزوں پر جان دیتے تھے ایک عطر اور ایک سبز دار مرغی کا جوڑا۔

عبادت سے فارغ ہوتے تو باہر آکر سبز دار مرغی کے جوڑے کو دانہ پانی دیتے اسکو دیکھ کر کبھی ہنستے کبھی روتے شاید ان کو خدا کی قدرتیں یاد آتی ہوں گی اور وہ ان مرغیوں میں کوئی جلوۂ الہٰی مشاہدہ کرتے ہونگے۔

غدر کی بھاگڑ

جب ۱۸۵۷ء کا غدر پڑا اور سب دلی والے شہر سے نکلے۔ بادشاہ اور انکی بیگمات، شہزادوں نے بھی قلعہ چھوڑا تو یہ فقیر شہزادے بھی اُٹھے [illegible] پاکر کھڑے ہو گئے۔ نوکروں نے عرض کی اور اشرفیاں ساتھ لے لیجئے بولے سب کچھ تم کو بخشا۔ ہم کو کسی چیز کی ضرورت نہیں [illegible] ہے۔ یہ کہا اور اپنا عطر کا صندوقچہ اور سبز دار مرغی [illegible] جوڑے لیکر چل کھڑے لوگوں نے سمجھایا صاحب عالم کیا غضب کرتے ہو کھانے پینے کا سہارا [illegible]

یہ عطر اور انڈے کس کام آئیں گے، روپیہ پیسہ لو جس سے گذر اوقات ہو۔ مگر انہوں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ ان کے ایک چھوٹی لڑکی اور ایک بیوی تھیں۔ ان کو نوکروں کے سپرد کیا اور کہا ان کے ساتھ رہو جہاں یہ چاہیں ان کو لیجاؤ۔ گھر میں جو کچھ نقدی ہے لے لو۔ خواہ تم رکھو۔ خواہ ان عورتوں پر خرچ کرو۔ مجھے نہ بیوی کا ساتھ دینا ہے نہ لڑکی کا نہ روپے پیسے کا۔

بیگم اور بیگم زادی کی بپتا

فقیر شہزادے عطر اور انڈے لیکر سیدھے درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں آ گئے اور درگاہ کے باہر ایک کھنڈر مکان میں بیٹھ گئے۔ ایک دیسی مرغی کا جوڑا خریدا اور وہ دونوں انڈے انکے نیچے بٹھا دیئے اور یاد حق شروع کر دی۔ کوئی روٹی دے گیا تو کھا لی ورنہ بھوکے پڑے رہے ہاں نماز پڑھتے تو عطر لگا کر پڑھتے کیونکہ ان کے حصہ میں عطر بہت تھا۔

نوکر، بیگم اور بیگم زادی یعنی ان کی بیوی اور لڑکی کو لیکر گڑگانوہ چلے گئے اور اس کے پاس سوہنہ قصبے میں ایک مکان لے کر رہنے لگے۔

چند دن تو نوکروں نے ان بیکس عورتوں کی خدمت کی لیکن چونکہ روپیہ پیسہ سب نوکروں کے ہاتھ تھا ان کو طمع دامنگیر ہوئی اور ایک دن عورتوں کو اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے اور نقدی ساتھ لے گئے۔ بیچاری شہزادی جو سویرے اٹھیں اور نوکروں کو آواز دی تو کوئی نہ بولا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو میدان صاف پایا۔ بہت روئیں۔ ہراساں ہوئیں۔ اب نہ کوئی سودا سلف لانے والا تھا نہ پانی بھرنے والا اور نہ کچھ پاس تھا جس کو خرچ کر کے کچھ منگائیں۔

لڑکی کی عمر چھ برس کی تھی۔ اور وہ معصوم جانتی نہ تھی کہ اس پر اور اس کے خاندان پر کیا کیا بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ چارپائی سے اٹھتے ہی سب سے پہلے حلوا مانگتی تھی اور بیگم سویرے سے تیار رکھتی تھیں آج نوکر نہ تھے سودا کون لاتا اور حلوا کہاں سے پکتا۔ لڑکی نے رونا شروع کیا وہ سمجھتی نہ تھی۔ اور اپنی غریب ماں کی پریشانی کو دوگنا کر دیا۔

مایوس بیگم نے پڑوس کے ایک سقہ کو آواز دی اور اپنے ہاتھ کے طلائی کڑے دے کر کہا

ان کو فروخت کر کے کھانے کا سامان لا دو۔ سونے کے کڑے دیکھ کر سقے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ جھٹکے سے لیئے اور دو چار روپیہ کا آٹا گھی شکر وغیرہ لا دی۔ بیگم نے باقی روپے مانگے تو بولا حسن بیٹے کے ہاتھ لوٹ بھیجے ہیں اس نے باقی دام ابھی دیئے نہیں۔ بیگم خاموش ہو گئیں۔

رات کو سقے نے بیگم کے گھر میں آکر جبکہ وہ سوتی تھیں۔ سارا اسباب کپڑے لتے سمیٹ لئے اور چل دیا۔ صبح کو بیگم اٹھیں تو بہت روئیں محلے والوں کو پکارا۔ معلوم ہوا غلے پڑوس سے چلا گیا ہے۔ یہ کام اسی کا ہو گا۔ اس وقت انہوں نے کڑوں کا حال بھی بیان کیا۔ ایک گھوسی کی عورت نے ترس کھا کر کہا بیوی اب میں تیرے پاس رہا کروں گی۔ تو گھبرا مت۔

بیگم کے پاس ان کڑوں کے سوا اور کچھ زیور نہ تھا۔ چند دن تو رکھے ہوئے آٹے سے گزارا ہوا اس کے بعد گھوسن نے اپنے پاس سے کھلایا۔

ایک دن گھوسن کے لڑکے نے ننھی بیگم کو دھکا دیدیا جس سے ننھی کی بھوؤں پھٹ گئی اور بہت خون بہا۔ بیگم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ اس نے گھوسن کے لڑکے کو برا بھلا کہا۔ اس پر گھوسن بگڑی اور کہا ہمارے احسان کو بھول گئی۔ ہمارے ٹکڑے کھاتی ہے اور ہمیں کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ بیگم سے یہ طعنہ نہ سنا گیا۔ اس نے آنکھوں میں بھر کر کہا۔

اری تو مجھ کو کیا روٹی کھلائے گی۔ میں اس باپ کی بیٹی ہوں جو سلطنت ہندوستان کے راجہ نوابوں کو روٹی کھلاتا تھا۔ جس کے دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے جو ہر بے کس کا والی اور پشت پناہ تھا۔ آج اگر میں تباہ ہو گئی تو کیا میری شرافت بھی جاتی رہی۔ میں تیرے طعنے نہ سہونگی اور آج سے تیری روٹی نہیں کھاؤں گی۔ تیرے بچے میری لاچار بچی کو لہولہان کریں اور میں چپکی بیٹھی دیکھوں۔ مجھ سے یہ نہ ہو سکے گا۔ تو نے جتنے دن روٹی کھلائی ہے میں اس کا بدل کر دونگی اور جب خدا میرے دن پھیرے گا تیرے احسان کا بوجھ اتار دونگی۔

خواب کا سانپ

اس دن غم میں بیگم نے کچھ نہ کھایا اور بچی زخم کی تکلیف میں تڑپتی رہی اس نے بھی کھانے کا

کچھ نہ مانگا۔ رات کو بیگم نے خواب دیکھا کہ مجھ کو ایک سانپ نے نگل لیا۔ اور اس کے اندر ایک باغ لگا ہوا ہے۔ باغ میں ایک تخت پر اس کے شوہر فقیر شہزادے بیٹھے ہیں اور اس کی لڑکی اپنے سر کا زخم ان کو دکھاتی ہے اور کہتی ہے کہ دیکھو ابا گھوسن کے لڑکے نے میرا سر پھوڑ ڈالا۔

اس پر فقیر شہزادے نے ہاتھ سے اشارہ کیا دو فرشتے آسمان سے اترے اور انہوں نے ایک سانپ لڑکی کے گلے میں ڈال دیا۔ بیگم یہ دیکھ کر ڈریں وہ چیخیں ہے ہے میری بچی۔ یہ کہتے ہی آنکھ کھل گئی تو سنا دروازہ پر کوئی کنڈی کھٹکھٹاتا ہے۔ انہوں نے کہا کون ہے آواز آئی تمہارا خاوند

بیگم حیران ہوئیں۔ آواز واقعی فقیر شہزادے کی تھی۔ کنڈی کھول دی وہ اندر آئے اور کہا چلو گاڑی تیار ہے۔ بیگم نے کہا کہاں چلوں اور تم کہاں سے آ گئے۔ اس کا انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکی کو گود میں اٹھایا اور بیگم کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ ہمراہ ہو گئیں باہر گاڑی کھڑی تھی اس میں سوار ہو کے درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں آ گئے۔ جب یہاں پہنچے تو ایک مکان میں بیگم اور لڑکی کو اتارا اور خود باہر چلے گئے۔ بیگم نے دیکھا مکان میں ضرورت کی سب چیزیں مہیا ہیں اور ایک صندوقچہ کھلا رکھا ہے اس کو جو دیکھا تو دو ہزار روپے کی اشرفیاں اس میں تھیں

بیگم کو بہت تعجب تھا کہ فقیر شہزادے کس طرح یہاں پہنچے اور یہ سب سامان کہاں سے آ گیا

تھوڑی دیر میں ایک شخص نے آواز دی کہ تمہارے شوہر کا جنازہ تیار ہے لڑکی کو صورت دکھاؤ تاکہ اس کے بعد ہم ان کو دفن کریں۔ بیگم کو بڑا خلجان ہوا کہ ابھی ان کو گھر سے لئے ہوئے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا مر کب گئے۔ بیگم نے پکارنے والے سے کہا تم کون ہو اور میرے شوہر کب مر گئے اس نے کہا اس کا حال مجھے معلوم نہیں کہ میں کون ہوں فقیر شہزادے صاحب کی وصیت تھی کہ میری میت ان کی لڑکی کو ضرور دکھاؤں۔ بیگم نے لڑکی کو ساتھ کیا اور خود کلیجہ تھام کر بیٹھ گئیں

تھوڑی دیر میں لڑکی واپس آئی اور کہا ابا جان مر گئے۔ ان کو قبر میں گاڑ دیا۔ لڑکی کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ شخص پھر آیا اور آواز دی اور کہا سنہ والی گھوسن کو انعام دیدیا گیا اب اس کا تم پر کچھ احسان باقی نہ رہا اور میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک یہ بچی جوان ہو تم کو چالیس روپے

ماہوار خرچ کے لئے ملیں گے اس کے بعد تم مر جاؤ گی اور یہ لڑکی اپنے خاوند کے ہاں چلی جائیگی
بیگم سے یہ عجیب باتیں برداشت نہ ہوئیں وہ غش کھا کر گر پڑیں اور جب ہوش آیا تو ایک ماما کو بیٹھا پایا۔ جس نے کہا۔ تم میرے ساتھ اور چلو۔ میاں نے وہاں تمہارے لئے گھر لیا ہے اور جا کر میں سارا حال بیان کرونگی۔ چنانچہ بیگم ماما کے ساتھ اور گئیں اور ایک اچھے گھر میں ان کو اتارا گیا اس وقت ماما نے کہا۔

فقیر شہزادے صاحب کا ایک روحانی موکل تابع تھا جس دن تمہاری لڑکی کے چوٹ لگی اسی دن تمہارے شوہر نے انتقال کیا۔ یہ سارا سامان جو تم نے دیکھا اسی موکل کا ہے اور لو یہ دیکھو کہ میں وہی موکل ہوں۔ تم آرام سے یہاں رہو میں تمہاری خدمت کروں گا اور جب لڑکی کی شادی ہو جائے گی تو میرا کام ختم ہو جائے گا۔ لڑکی کو میں نے ہی اس کے باپ کی میت قبر کے اندر مرحوم کی وصیت کے مطابق دکھائی تھی۔ یہ کہہ کر ماما غائب ہو گئی اور بیگم کو لڑکی کی شادی تک غیبی آدمی خرچ پہنچاتا رہا۔ لڑکی کی شادی کے بعد بیگم مر گئیں اور غیبی موکل کا کام ختم ہوا

جاذب کاغذ کی کہانی

خفیہ پولیس نے سارے گھر کی تلاشی لی۔ ہر صندوق کو الماری کو یہاں تک کے کتابوں کے ورقوں کو کھول کھول کر دیکھا مگر جس خط کی تلاش تھی وہ دستیاب نہ ہوا۔ ہاں ردی کی ٹوکری میں ایک پھٹا ہوا کاغذ ضرور ملا۔ جو غالباً کسی خط کا لفافہ تھا اور ٹکٹ کا آدھا حصہ اس میں باقی تھا جس پر ڈاکخانہ کی مہر کے چند حروف نظر آتے تھے۔ انسپکٹر مرتضیٰ خاں نے اسی ٹکڑے کو اٹھا لیا اور چار گھنٹہ کی محنت میں ایک ننا سا پرزا لیکر دفتر کو واپس گیا۔

یہ تلاشی ایک درویش کے مکان کی تھی۔ جس پر راجہ ہر سپرشاد کو شبہ تھا کہ انکی رانی کو شاہ صاحب نے زہر دیدیا ہے راجہ صاحب نے پولیس میں خبر کی اور بیان لکھوایا کہ میرے

حریف ہردیو سنگھ نے جو میری رانی کے امیدوار تھے مگر کامیاب نہ ہوئے تھے حسد و رقابت سے نقیر صاحب کی معرفت زہر دلوایا اور رانی مرمر کر بچیں، راجہ صاحب نے کہا میری رانی ان شاہ جی کی بہت معتقد تھی۔ اور جب اس کی مجھ سے شادی نہ ہوئی تھی تو شاہ صاحب کے پاس اکثر حاضر ہوتی تھی اور شاہ صاحب بھی اس کے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ شادی ہونے کے چھ مہینے بعد

گلاب کے دو پھول

لیکر شاہ صاحب میرے مکان پر آئے اور کہا یہ اپنی رانی کو کھلا دو۔ اس سے دو بیٹے پیدا ہوں گے جن کی صورت پھول کی طرح اور سیرت اس کی خوشبو کی مانند ہوگی۔ میں نے وہ پھول رانی کو دے دیئے اور اس نے حسن عقیدت سے ان پھولوں کو کھا لیا۔ آٹھ دن تک تو کچھ معلوم نہ ہوا مگر نویں دن خود بخود رانی کو کھانسی شروع ہوئی اور بخار بھی آنے لگا، ڈاکٹروں نے دق کا مرض تجویز کیا۔

مجھ کو یکایک پھولوں کا خیال آیا اور وہم ہوا کہ شاید ان میں کچھ خرابی نہ ہو اس واسطے خفیہ تحقیقات شروع کی تو معلوم ہوا کہ میرے رقیب اور دشمن ہردیو سنگھ کی آمد و رفت شاہ صاحب کے ہاں بہت ہے اور اسی نے پھولوں میں کوئی ایسی زہریلی چیز لگا کر دلوائی جس نے میری رانی کا پھیپھڑا خراب کر دیا۔ میں نے ڈاکٹروں سے یہ کیفیت کہی اور انہوں نے مریضہ کے بلغم کی تحقیقات کر کے بتایا کہ واقعی اس میں ایک ایسے زہر کا اثر پایا جاتا ہے جو کیڑوں کی شکل میں ہوتا ہے اور جس کی دوا سازوق کے بیماروں کے بلغم سے بنایا کرتے ہیں۔

یہ سنکر میں نے مریضہ کے علاج میں دوسری قسم کی کوشش شروع کی جس کا نتیجہ اچھا نکلا اور رانی تندرست ہو گئی اب میں پولیس میں اطلاع دیتا ہوں کہ شاہ صاحب اور ہردیو سنگھ کی اس سازش اور اقدام قتل عمد کی کوشش کو تحقیقات کیا جائے۔

راجہ صاحب نے پولیس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ۹ مئی سنہ ۱۹۱۱ء کو ایک خفیہ خط ڈاک میں شاہ صاحب کے نام آیا تھا۔ یہ ہردیو سنگھ کا لکھا ہوا تھا اور وہ زہر اس کے اندر بند تھا۔

پولیس کو اسی خط کی تلاش تھی۔ انسپکٹر مرتضیٰ خاں کو جو پڑھ رہے تھے کا خط اس ۹ مئی کی مہر

کے حروف پڑھے جاتے تھے اور کچھ حصہ فرسودہ کی عبارت کا بھی تھا جو پتے کا رخ تھا مگر اس
میں صرف دو یا تین حروف تھے۔

ہردیو سنگھ کا مکان

پولیس ہردیو سنگھ کے مکان پر گئی اور وہاں بھی اس نے خوب تلاشی لی مگر کوئی چیز مشتبہ
برآمد نہ ہوئی۔ انسپکٹر مرتضیٰ خاں کو جب بالکل مایوسی ہو گئی تو میز کے پاس کھڑا ہو کر کچھ سوچنے لگا۔
یکایک اس کی نگاہ بلاٹنگ پیپر یعنی جاذب کاغذ پر پڑی جو چمڑے کے ایک حلقے میں لگا ہوا میز پر رکھا تھا
انسپکٹر جھک گیا اور کاغذ کو غور سے دیکھنے لگا اس کو کچھ مٹے مٹے حروف نظر آئے مگر ۹ مئی تو
صاف پڑھا جاتا تھا۔ انسپکٹر نے وہ کاغذ اٹھا لیا اور اپنے ساتھ لے گیا۔

دفتر میں جا کر انسپکٹر مرتضیٰ خاں نے آئی گلاس سے کئی گھنٹے غور کیا اور آخر اس کو معلوم ہو گیا
کہ شاہ صاحب کے گھر سے جو لفافہ کا پرزہ ملا ہے اس کا لکھنے والا ہردیو سنگھ ہے اور ۹ مئی کو یہ خط
لکھا گیا تھا اب انسپکٹر مرتضیٰ خاں کو خیال آیا کہ راجہ ہر پرشاد کو اس تاریخ کی ایسی صاف خبر کیونکر
ہو گئی ہردیو سنگھ تو اس کا دشمن ہے جیسا کہ ہر پرشاد نے بیان کیا۔ دشمن کے گھر کی ایسی مخفی اطلاع
راجہ تک کس طرح آئی۔ انسپکٹر نے ہر چند سوچا سمجھ میں نہ آیا آخر وہ سیدھا راجہ کے پاس آیا اور اس
سے دریافت کیا۔ راجہ اس سوال سے کچھ گھبرا سا گیا اس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں مگر اس نے
جلدی اپنے آپ کو سنبھال کر کہا میں اس راز کو عدالت میں ظاہر کروں گا آپ کو نہیں بتا سکتا۔

انسپکٹر کو شک ہوا اس نے ذرا تیوری بدل کر کہا آپ کو بتانا ہو گا میں اس بھید کے بغیر اپنی
تحقیقات کو مکمل نہیں کر سکتا۔ مجھے شک ہوتا ہے کہ خود آپ ہی اس جرم کے مجرم ہیں آخری فقرہ
نے راجہ کو اور پریشان کر دیا وہ چاہتا تھا کہ اپنے چہرہ پر اندر کی کیفیت کو نہ آنے دے اور انسپکٹر
کے سامنے سچا بنا رہے مگر نہ ہو سکا اور گنہگار دل نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا راجہ کی ہوشیاری خاک
میں مل گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا آپ بگڑتے کیوں ہیں میں آپ کے حقوق کو پامال نہیں
کروں گا۔ آپ کو نہال کر دوں گا بشرطیکہ آپ میرے ساتھ اچھا برتاؤ رکھیں۔

انسپکٹر کا شبہ پختہ ہو گیا۔ اس نے کہا میں دس ہزار روپے اسی وقت چاہتا ہوں تاکہ بات مخفی رکھی جا سکے اب تو معاملہ سر رشتے میں آ گیا ہے راجہ پھر سنبھلا اور کہا معاملہ آپ کے اختیار میں آ گیا ہے میں اس کو نہیں سمجھا میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کا برتاؤ میرے ساتھ شریفانہ ہوا اور آپ ایسے الفاظ کہکر کہ میں مجرم ہوں میری توہین نہ کریں۔ میں اپنی چاہتی بیوی کو زہر دینے والا ہوں کیا میں خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا میں نے ہرگز اپنی رانی کو زہر نہیں دیا۔ میں دس ہزار کی کثیر رقم اس معاملہ میں آپ کو دوں اگر آپ مجرم کا سراغ نکال لیں گے تو بیشک آپ کو دو ہزار روپے انعام دونگا، انسپکٹر نے کہا میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ سارا جال آپ ہی کا ہے اب دس ہزار روپے آپ کی آبرو اور جان بچا سکتے ہیں۔ ورنہ باہر کے سپاہی کو آواز دیتا ہوں وہ آپ کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ڈال کر تھانے لیجائے گا اس وقت معلوم ہو گا کہ مجرم کون ہے اگر جرم آپ پر ثابت نہ ہوا تو میں نہایت ادب سے اس گستاخی کی آپ سے معافی چاہوں گا

راجہ اس گفتگو سے سناٹے میں آ گیا اس نے کچھ سوچا اور چاہا کہ ایک دھمکی اور دے اور ایک دفعہ اپنی فرضی بے قصوری ظاہر کرنے کو لاعلمی کے تیور اور دکھائے مگر اس کے چہرے نے بے نہ ہونے دیا وہ کانپنے لگا اور جلدی سے اٹھ کر بکس کھولا اور دس ہزار کے نوٹ انسپکٹر کے آگے نکال کر رکھ دیئے انسپکٹر نے نوٹ لیکر شکریہ ادا کیا اور یہ کہکر کہ اب آپ اطمینان رکھئے چل دیا

پردہ کھل گیا

انسپکٹر مرتضیٰ خاں نوٹ لیکر سیدھا دفتر پہنچا اور حالات کی رپورٹ تیار کر کے ان نوٹوں سمیت اپنے رہین افسر کو بھیجدی۔

دوسرے دن پولیس کے بڑے بڑے افسر راجہ کے ہاں پہنچے اور اس کو گرفتار کر لیا اور مقدمے کی تفتیش شروع ہوئی اور راجہ نے سارا حال خود ہی سچ سچ بتا دیا۔

اس نے کہا میں نے اپنی رانی کی ریاست پر قبضہ کرنے کے لئے یہ چال چلی تھی رانی اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی ہے اس کے باپ نے ریاست میرے نام لکھدی ہے۔ مگر اس میں شرط

یہ ہے کہ لڑکی کے باپ کی زندگی تک اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں گے اور اس کے مرنے پر لڑکی مالک ہوگی اور کارگذاری اس کا خاوند کرے گا۔

میں نے پہلے اپنے خسر کو زہر دلوایا جب وہ مرگیا تو اپنی بیوی کے مارنے کی تجویز کی تاکہ اسکی ریاست پر کلی اختیار حاصل ہو کیونکہ میری رانی میری داشتہ عورت کے سبب اپنی ریاست کی آمدنی سے مجھ کو کچھ نہ لینے دیتی تھی۔

یہ کام آسان نہ تھا کیونکہ رانی بہت ہوشیار تھی اور اس کو میری طرف سے شبہ پڑا ہوا تھا اور میرے ہاتھ کی کوئی چیز کھاتی پیتی نہ تھی۔ اسواسطے میں نے اپنے ایک نہایت رازدار نوکر کو اپنے خاندانی دشمن ہردیو سنگھ کے ہاں بھیجا۔ میرا نوکر ہردیو سنگھ کا ملازم ہوگیا اور چند روز میں اس نے اس کے مزاج پر خوب قبضہ کرلیا۔

ایک دن باتوں باتوں میں میرے نوکر نے ہردیو سنگھ سے کہا ہرپرشاد کے ہاں نئی رانی سے کوئی اولاد نہیں ہے اگر یہ بے اولاد مرگئی تو ہرپرشاد اسکی ریاست کا بھی مالک ہوجائیگا آپ رانی کے باپ کے دوست ہیں دوست کا فرض ہے کہ ایسے موقع پر جبکہ دوست مرگیا ہے اس کی ریاست اور اس کی اولاد کی خبرگیری کریں۔

ہردیو سنگھ نے کہا میں کیا کرسکتا ہوں اولاد کا دینا خدا کے اختیار میں ہے میرا اس میں کیا بس ہے میرے نوکر نے کہا چترپور کے پہاڑ میں ایک ہندو فقیر بڑا کامل ہے وہ جنگلی گلاب کے دو پھول دیتا ہے جو عورت یہ پھول کھالے اسکے اولاد ہوجاتی ہے چاہے وہ عورت بانجھ ہی ہو ہردیو سنگھ کو میری رانی سے محض اس کے باپ کی دوستی کے سبب محبت تھی اور وہ اس کی ریاست کو اسی کے خاندان میں دیکھنا چاہتا تھا اسواسطے اس نے میرے نوکر کو پھول لانے کے لئے کہا۔ مگر اس کے ساتھ ہی سے خیال آیا کہ رانی سوائے ایک مسلمان شاہ صاحب کے اور کسی پیر فقیر کو نہیں مانتی اس کا بچپن سے ایک مسلمان شاہ صاحب پر اعتقاد ہے وہ ہندو فقیر کے ہاتھ کے پھول ہرگز نہیں کھائے گی۔

میرے نوکر نے کہا یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ آپ وہ پھول مسلمان شاہ جی کے ہاتھوں بھجوا دیجئے گا۔ ہردیو کو یہ بات پسند آئی اور اس نے میرے نوکر کو خرچ دے کر جیر پور جانے کو کہا۔ نوکر میرے پاس آیا میں نے فوراً ایک دوست ڈاکٹر کے ذریعے دق کے جراثیم حاصل کئے اور گلاب کے پھول پر ڈال کر نوکر کو دیدیئے جس نے ہردیو سنگھ کو پھول جا کر دیئے ہردیو سنگھ شاہ جی کے پاس آیا اور ان سے سارا قصہ سچ سچ کہدیا اور کہا رانی آپکو ہی مانتی ہے آپ جا کر دے آئیے۔ مگر میرا ذکر مخفی رہے ممکن ہے راجہ ہر پرشاد سابقہ عداوت کے سبب یہ پھول نہ کھانے دے۔ شاہ صاحب نے منظور کیا اور پھول لا کر میری رانی کو دیئے جسکو اس نے کھا لیا۔

چونکہ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ ۹ مئی ۱۹۱۱ء کو ایک خط ہردیو سنگھ نے شاہ صاحب کو بھیجا ہے جس کے حروف اور تاریخ جاذب کاغذ پر موجود ہیں تو میں نے اپنے نوکر کو شاہ صاحب کے ہاں بھیجا اس نے دیکھا کہ شاہ صاحب نے خط پڑھ کر چاک کر دیا اور ردی میں ڈالدیا میرے نوکر نے وہ ٹکڑے چپکے سے اٹھا لئے اور اپنے پاس رکھے اور جس دن شاہ صاحب کے ہاں تلاشی ہو رہی تھی تو میرے نوکر نے صرف لفافے کا ٹکڑا ٹوکری میں ڈال دیا اور اسی کے اشارے سے انسپکٹر نے اسکو ٹوکری سے لیا اور ہردیو سنگھ کے ہاں تلاشی میں میرے ہی نوکر نے ایسی حرکت کی جس سے انسپکٹر پولیس کی نظر جاذب کاغذ پر پڑ گئی۔

افسر نے پوچھا تو تم نے پھر رانی کا علاج کیوں کرایا۔ اور اس کی تحقیقات کیوں کرائی اور ایسی جلدی اپنے جرم کا اقرار کیوں کر لیا۔

بھوت ستاتا ہے

ہر پرشاد راجہ نے کہا ایک بھوت نے مجھ کو مجبور کر رکھا ہے وہ رات کو سوتے میں میرے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے میں رانی کا محافظ ہوں۔ مجھ کو مسلمان شاہ جی نے بھیجا ہے تو فوراً علاج کرا دو ورنہ میں تجھ کو جان سے مار ڈالوں گا۔

اس کے علاوہ مجھ کو راز فاش ہو جانے کا بھی خوف تھا اس واسطے میں نے خود ہی

مریضہ کا امتحان کرایا تھا تاکہ مجھ پر شبہہ نہ کیا جائے مگر اسی موذی عورت نے جو سبز کپڑے پہنے سفید ڈاڑھی لگائے خواب میں آتا ہے۔ مجھ پر جادو کر دیا اور میں نے بے اختیار ہو کر ساری داستان بیان کر دی۔

مقدمہ

جب تحقیقات ختم ہو چکی تو مقدمہ عدالت میں گیا اور وہاں شاہ صاحب کے بیان بھی ہوئے شاہ صاحب کچھ نیم مجذوب سے آدمی تھے جب انہوں نے وکیل کے سوالات کا الٹا سیدھا جواب دینا شروع کیا تو عدالت کو کچھ شک ہوا اس پر ہردیو سنگھ کے وکیل نے کہا (جو ایک فقیر نش فقیر شناس ہندو تھا) کہ جناب عالی، شاہ صاحب مجذوب ہیں ان کے بیان پر جرح نہ ہونی چاہئے۔ عدالت نے پوچھا مجذوب کیا ہوتا ہے۔

راجہ ہرپرشاد کے وکیل نے کہا دیوانے کو توہم پرست لوگ مجذوب کہتے ہیں۔

اس پر عدالت بولی کہ دیوانے کی بات پر اعتبار نہیں ہو سکتا اس واسطے یہ گواہ عدالت سے باہر کر دیا جائے ہم اس کا بیان لینا نہیں چاہتے۔

یہ سنکر شاہ صاحب کو کچھ جوش سا آگیا انہوں نے نہایت عاقلانہ انداز سے آگے بڑھ کر کہا۔

مجذوبیت کا فلسفہ

اے حاکم میں دیوانہ نہیں ہوں۔ تو میری باتوں سے انصاف کرنے میں پس و پیش نہ کر۔ میرے دماغ میں فتور نہیں ہے میری عقل میں کچھ خرابی نہیں ہے میں عدالت کو خدا کی نائب اور مجازی عدالت سمجھتا ہوں اور اپنے پورے ہوش و حواس کی سلامتی میں بتاتا ہوں کہ مجذوب دیوانے کو نہیں کہتے مدعا علیہ کے وکیل نے غلط کہا کہ دیوانے کو مجذوب اور مجذوب کو دیوانہ کہا جاتا ہے۔ مقدمہ کی مثل میں ایک جاذب کاغذ بھی ہے اور اس کے اوپر مجذوب حروف بھی ہیں اس کو مقدمے کی روئداد سے بہت کچھ تعلق ہے عدالت ان حروف پر اور اس کاغذ پر غور کرے گی تو اسکو چاہیے کہ اس وقت میرے بیان مجذوب جاذب پر بھی توجہ کرے!

لے کرسی پر بیٹھنے والے آسمان پر بھی ایک عرش و کرسی ہے وہاں کے نوشتے جن کاغذوں پر لکھے جاتے ہیں ان کو فقرا کی اصطلاح میں سالک کہتے ہیں اور ان تحریروں کو جاذب کاغذ سے جب خشک کیا جاتا ہے تو جاذبوں پر کچھ حروف مجذوب ہو جاتے ہیں وہ حروف پورے نہیں ہوتے ان سے وہ مطلب نہیں نکل سکتا جو صاف لکھے ہوئے اصلی کاغذوں سے نکلتا ہے مگر جاذبوں کے وہ حروف بھی کبھی وہ کام دے جاتے ہیں جو آج کے جاذب کاغذ سے نکلا۔

خطوط چلے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سالک ہیں مگر جاذب اور اس کے مجذوب حروف رہ جاتے ہیں۔ اور ہمارے مقدمات میں کبھی کبھی کام آتے ہیں ورنہ بے نشان اور بے مطلب پڑے رہتے ہیں۔

میں نے کہا عرش پر کاغذ ہوتے ہیں لکھائی ہوتی ہے اور اس کو جذب کیا جاتا ہے یہ سب بے خبروں کے سمجھانے کے الفاظ ہیں اور مثالیں ہیں۔ ورنہ وہ عالم بالا کاغذ بازی سے پاک ہے۔

عدالت کو اس تقریر سے بہت تعجب ہوا اور اس نے راجہ ہر پرشاد کو پھانسی کی سزا دیتے ہوئے شاہ صاحب کے بھیجے ہوئے بھوت یا روح مخفی یا موکل پر اور انکی عجیب و غریب تقریر پر اور انکی کرامت باطنی پر بہت اچھے الفاظ میں رائے زنی کی اور آخر میں لکھا کہ یہ محض شاہ صاحب کی صداقت ہے جو ایسا پیچیدہ مقدمہ کھل گیا ورنہ راجہ ہر پرشاد کی چال کا سمجھنا بہت دشوار تھا۔

عدالت خیال کرتی ہے کہ مشرق کے کمالات مغرب کے کرشمۂ سائنس سے اب تک بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں جس پر اہل مشرق جس قدر فخر کریں بجا ہے۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁

انگلی کی کہانی

ایک سچا قصہ جو تاریخ فرشتہ کے تیسرے مقالے سے ماخوذ ہے

دہلی کا ایک غریب گھر

سلطان غیاث الدین تغلق کا زمانہ تھا دہلی قطب مینار سے تغلق آباد اور اندرپرست کے قلعہ کہنہ تک آباد تھی، ترک۔عرب۔ایرانی۔تورانی چینی ہر قسم کے آدمی اس ہندوستانی پایہ تخت میں پھرتے نظر آتے تھے۔ ارزانی تھی۔غریب سے غریب آدمی بھی خوش اور بے فکر تھا۔ پایہ تخت ہونے کے سبب شہر میں سینکڑوں ڈیوڑھیاں قائم تھیں، روپیہ اشرفی کا مینہ برستا تھا مگر باوجود اس عام دولت مندی کے ہزاروں غریب بھی ایسے تھے جن کے ہاں کئی کئی وقت کے فاقے ہو جاتے تھے اور ان کو کہیں سے ایک ٹکڑا میسر نہ آتا تھا۔

آج لندن وہ پایہ تخت ہے جس کی حکومت دنیا کے بڑے حصہ پر ہے مگر وہاں بھی غریبوں کی کمی نہیں ہزاروں روٹی کپڑے سے محتاج پڑے پھرتے ہیں یہ قدرت کی شان ہے جس کا بھید کوئی نہیں جان سکتا۔ تغلق کے زمانہ کی مذکورہ دہلی میں بھی ایک غریب گھر تھا جہاں ایک بڑھیا عورت رہتی تھی جس کے دو بچے تھے ایک لڑکی ایک لڑکا۔ گزارہ کا کچھ سامان نہ تھا لڑکی نابینا تھی۔ لڑکا جس کا نام حسن تھا پندرہ برس کا تھا صورت شکل اس کی بہت اچھی تھی کیونکہ ایک شریف باپ کا بیٹا تھا مگر فاقہ کشی کے سبب سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔

ایک دن گرمی شدت کی پڑ رہی تھی۔ بیچارا حسن نوکری کی تلاش میں سارا دن پھرا مگر کہیں نہ ملی۔ شام کو تھکا ہارا گھر میں آیا اور رونے لگا۔ بڑھیا ماں نے

دلاسا دے کر کہا بیٹا گھبراؤ نہیں خدا یہ مصیبت کے دن نکال دیگا کسی آدمی کو خدا نے ہمیشہ پریشانی میں نہیں رکھا وہ بڑا رازق ہے اس کو فضل کرتے دیر نہیں لگتی۔

حسن بولا۔ ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں مگر آخر مصیبت کی کوئی حد بھی ہو۔ کل شام سے کچھ کھایا نہیں۔ سویرے گیا اب شام کو آیا۔ سارا دن لوگوں کی خوشامدیں کیں مگر کسی نے بات نہ پوچھی۔ دیکھتا ہوں ترک امیروں کے غلام میری عمر کے ہیں زرق برق لباس پہنے جڑاؤ تلواریں باندھے گھوڑے دوڑاتے پھرتے ہیں ایک میں ہوں جس کو کوئی ایک وقت کی روٹی پر بھی نوکر نہیں رکھتا۔ مجھے سب سے زیادہ تمہارا اور اس اندھی بہن کا خیال ہے کہ تم لوگ فاقہ کشی سے مرنے کے قریب ہو گئے ہو۔

ماں نے کہا جو خدا کی مرضی ہم ہر حال میں صبر شکر کرتے ہیں۔ تم جی میلا نہ کرو۔ آخر یہ سب بھوکے پڑے رہے۔ رات کو سردی بہت زیادہ ہوئی اور ان کے پاس گرم کپڑے بالکل نہ تھے آدھی رات کو اندھی بہن کی پسلی میں درد ہوا اور صبح تک وہ بیچاری سردی اور درد میں تڑپتی رہی۔ دوپہر کو غریب کا خاتمہ ہو گیا۔ پہلے تو ماں بیٹے بہت روئے۔ چوتھا وقت فاقہ کا تھا اس پر یہ نئی افتاد پیش آئی محلے میں خبر ہوئی تو مسلمانوں نے گور و کفن کا سامان کیا اور ان دونوں کو بھی کچھ دیا جس سے انہوں نے دو چار دن آرام سے بیٹھ کر کھایا۔

حسن پھر نوکری کی تلاش میں نکلا مگر جب کہیں کامیابی نہ ہوئی تو اسکے جی میں آیا کہ حضرت نظام المشائخ

خواجہ نظام الدین اولیاؒ

کی خدمت میں چلنا چاہیئے۔ وہ دعا بھی کرینگے اور شاید ان کے ذریعے سے کہیں نوکری مل جائے

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی خاص خانقاہ غیاث پور میں آبادی شہر سے ایک کنارہ پر تھی حسن سیدھا خانقاہ پر آیا اور یہاں آکر دیکھا جوق جوق خلقت اندر جاتی ہے اور باہر آتی ہے اس نے لوگوں سے پوچھا آج کیا بات ہے اتنے آدمی کیوں آتے جاتے ہیں یہ کوئی خاص دن ہے یا ہمیشہ یہاں یہی حال رہتا ہے۔

جواب دیا گیا یہاں ہر روز یہی حال رہتا ہے اس وقت لنگر کی تقسیم ہوتی ہے اور دسترخوان
بچھا ہوا ہے ہزاروں آدمی بیٹھتے ہیں کھانا کھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں یہ لنگر روزانہ ایسا ہی رہتا ہے
حسن نے پوچھا کھانا ہر شخص کو ملتا ہے یا جو مقررہ جانے والے ہیں وہی کھاتے ہیں۔ کہا گیا
لنگر عام ہے جس کا جی چاہے جا کر کھائے۔ حسن نے بھی چاہا کہ اندر جائے مگر اس کو شرم دامن گیر
ہوئی اور خیال آیا کہ شاید محتاجوں اور فقیروں کا حق ہے۔ میں جوان ہوں مجھے زیبا نہیں
کہ خیرات کی روٹی کھاؤں۔ اگرچہ تقدیر نے چار دن پہلے یہ آن توڑ دی ہے۔ جب بہن
مری تھی تو لوگوں نے صدقے خیرات کے روپے دیئے تھے اور مجھ کو وہ خیرات کھانی پڑی
مگر وہ مجبوری کا وقت تھا اب مجھ کو مجبوری نہیں ہے کیونکہ تین وقت فاقہ نہیں ہے جو
صدقہ اور خیرات حلال ہو جائے۔

اسی اثنا میں خانقاہ کے اندر سے ایک نوجوان نکلا اور سیدھا ایک طرف کو چلا گیا
جب وہ جا رہا تھا تو لوگوں نے چپکے چپکے آپس میں کچھ باتیں شروع کیں۔

ایک نے کہا یہ وہی ہیں۔ دوسرے نے کہا وہ ہوتے تو سوار پیادے ہمراہ آتے اکیلے
بھی کہیں آیا کرتے ہیں۔ تیسرے نے کہا یقیناً وہی ہیں کیونکہ میں ابھی حضرت محبوب الٰہی کے
پاس سے آیا ہوں جب کھانا کھا کر باہر نکلنے لگے تو حضرت نے فرمایا دیکھو بادشاہ جاتا ہے۔
چوتھا بولا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے اس کے باپ سلطان غیاث الدین تغلق نے تو اپنے چھوٹے
بیٹے کو ولی عہد کیا ہے۔ بادشاہ تو وہ ہوگا۔ اندر سے آنے والے نے کہا میاں بزرگوں کی
زبان غیبی قدرت کے الفاظ بولا کرتی ہے۔ گو بادشاہ نے اپنے اس بڑے بیٹے کو ولیعہدی
سے خارج کر دیا ہے لیکن جب حضرت نے یہ فرمایا کہ بادشاہ جاتا ہے تو یقیناً یہی بادشاہ ہوگا
ایک شخص نے کہا بیشک ہمارا ایمان ہے سلطان المشائخ قطب وقت ہیں انہوں نے
غیبی مکاشفہ سے یہ فرمایا ہوگا اور سلطان غیاث الدین تغلق کا یہی بیٹا جس سے سلطان ناراض
ہے آخر کو بادشاہ ہوگا مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ فقیروں کا سا لباس پہن کر اور بھیس

بدل کر لنگر کا کھانا کھانے آیا۔

دوسرے نے کہا میاں اس لنگر سے فقیری کی برکت حاصل کرنے آیا ہوگا۔ بتاتے ہیں کہ جس نے فقیروں اور کالوں کے گھر کا ٹکڑا کھا لیا اس کو دینی اور دنیاوی دونوں نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

میں نے دیکھا سلطان وقت کے اس لڑکے نے عام فقیروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور جب چلنے لگا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس سے بھی اوروں کی طرح مصافحہ کیا جس وقت مصافحہ ہو رہا تھا میں نے دیکھا حضرت ذرا مسکرائے اور یہ شہزادہ بھی مسکراتا ہوا دروازہ کی طرف چلا۔ دروازے پر پہنچا تو حضرت نے فرمایا دیکھو بادشاہ جاتا ہے۔

ہاں ایک بات تو میں بھول گیا حضرت محبوب الٰہیؒ نے جس وقت یہ فرمایا کہ بادشاہ جاتا ہے تو یہ بھی فرمایا تھا ایک بادشاہ باہر چلا۔ دوسرا اندر آتا ہے۔ ہم لوگوں نے دیکھا کہ اس کے نکلنے کے بعد اندر اور کوئی نہ آیا۔ خبر نہیں وہ کون شخص ہے جس کے بارے میں یہ ارشاد ہوا کہ ایک بادشاہ اندر آتا ہے۔

یہ لوگ باتیں کرتے ہوئے چلے گئے اور حسن دروازہ پر بیٹھ گیا اس نے خیال کیا جب اندر کوئی نہیں جاتا تو شاید کھانا ختم ہو چکا اور دسترخوان اٹھ گیا اب میں جاؤں یا نہ جاؤں دل نے کہا تو کھانے کے لئے نہیں آیا تھا۔ تیرا مقصد تو حضرت محبوب الٰہیؒ سے ملنا تھا چل اور حضور کی قدمبوسی حاصل کر۔

یہ ابھی ان خیالات میں تھا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے خانقاہ کے اندر اپنے خادم سے فرمایا۔ جاؤ باہر سے بادشاہ کو بلا لاؤ۔ خادم باہر آیا اور چاروں طرف دیکھا وہاں حسن کے سوا اور کوئی نہ تھا اس واسطے وہ پھر اندر چلا گیا اور جا کر عرض کی حضور باہر تو کوئی بادشاہ نہیں آپ نے فرمایا اچھی طرح دیکھو بادشاہ وہیں بیٹھا ہے۔ خادم پھر آیا۔ حسن کو دیکھا کہ پھٹے کپڑے شکستہ حال بیٹھا ہے اس نے سوچا یہ تو فقیر یا کوئی بھکاری ہے بادشاہ تو یہاں

کوئی نہیں ہے دوبارہ جا کر عرض کیا سرکار میں نے دیکھ لیا وہاں کوئی نہیں ہے۔ صرف ایک گداگر اور غریب جوان بیٹھا ہے۔ آپ نے فرمایا میں اسی کو بلاتا ہوں۔ وہی بادشاہ ہے۔ خادم باہر گیا اور حسن کو بلا کر اندر لایا۔

حسن نے جھک کر زمین چومی اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا حضرت نے مسکرا کر فرمایا آئیے بادشاہ سلامت۔ حسن نے عرض کی آپ جیسے شہنشاہِ دین کا دیدار بادشاہی سے زیادہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ آج میں بادشاہ ہوں جو ایسے عالی مقام سلطان عاقبت کے قدموں میں حاضری نصیب ہوئی حضرت نے اس کا جواب کچھ نہ دیا اور حسن کو بغور دیکھ دیکھ کر تبسم فرماتے تھے۔

اس کے بعد خادم سے پوچھا کچھ کھانا ہے۔ اس نے عرض کی اب تو ختم ہو چکا اور کچھ باقی نہیں۔ فرمایا اچھا میرے افطار کی روٹی لاؤ۔

حضرت محبوب الہیٰؒ دن بھر روزہ رکھتے تھے اور شام کو جو کی روٹی سے افطار کرتے تھے اور شام کے وقت ہمیشہ دو جو کی روٹیاں آپ کے لئے پکتی تھیں۔

خادم وہ نان جو سامنے لایا۔ حضرت نے ایک ٹکڑا اس میں سے توڑا اور فرمایا۔

"لے حسن یہ دکن کی سلطنت کا تاج ہے اور اس ٹکڑے کو اپنی کرامت کی انگلی پر رکھ کر ایک نگاہ اس پر ڈالی اور حسن کو وہ ٹکڑا دے دیا۔ حسن آداب بجا لایا اور قدموں کو بوسہ دے کر خوش و خرم باہر نکلا اور سیدھا والدہ کے پاس آیا اور اس کو یہ خبر دی۔ والدہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ اور کہا خدا تجھ کو ضرور بادشاہ دکن کرے گا۔ ان کا فرمانا بھید سے خالی نہیں ہے حسن گھر سے نکل کر پھر روزگار کی تلاش میں چلا راستے میں اس کو ایک ہندو نجومی جس کا نام کانگو ہی برہمن تھا ملا۔ حسن نے اس سے بھی اپنی حالت کہی اور نوکری چاہی کانگو ہی برہمن نے حسن کو پہلے تو غور سے دیکھا۔ اس کے بعد اپنے گھر لے گیا اور کہا میری فلاں زمین کھیتی کے قابل ہے لو یہ بیل اور ہل تم کو دیتا ہوں۔ وہاں جا کر ہل چلاؤ

اور کھیتی کرو۔ تمہارا کھانا کپڑا میرے ذمے ہے۔

حسن نے قبول کیا۔ اور ہل لیکر کھیتی شروع کر دی۔ دوسرے دن حسن ہل چلا رہا تھا کہ اس کے ہل کی پھالی کسی چیز سے اٹکی۔ اس نے جو وہاں کھود کر دیکھا تو ایک تانبے کی دیگ نکلی جس میں سلطان علاء الدین خلجی کے سکہ کی اشرفیاں بھری ہوئی تھیں۔

حسن اس دیگ کو مزدوروں سے اٹھوا کر اپنے آقا کانگوئی بہمن کے پاس لایا اور اس کے آگے رکھ کر سارا حال بیان کیا۔

کانگوئی بہمن کو حسن کی ایمانداری سے بہت تعجب ہوا۔ ایسا غریب آدمی جو روٹی تک سے محتاج ہے اس نے اشرفیاں لا کر مجھ کو دیدیں۔ چاہتا تو خود رکھ لیتا مجھے کیا خبر ہوتی کہ میری زمین میں سے خزانہ نکلا ہے۔

کانگوئی بہمن بڑا اچھا نجومی تھا اور سلطان غیاث الدین تغلق کے بڑے لڑکے تک اس کی اسی نجوم کے سبب رسائی تھی۔

دوسرے دن کانگوئی بہمن شہزادے کے پاس گیا تو اپنے ملازم حسن کی دیانتداری کا قصہ اس سے کہا شہزادے نے حکم دیا حسن کو ہمارے پاس بھیجدو۔ کانگوئی بہمن حسن کو لے کر شہزادے کے پاس حاضر ہوا۔ شہزادے نے حسن کی اچھی صورت دیکھ کر اور دیانت داری کی حالت سن کر اسی وقت اس کو اپنے خاص امیروں میں داخل کر لیا۔

شہزادے کے امیروں میں حسن داخل ہو گیا تو دوسرے دن کانگوئی بہمن نے اس کو اپنے پاس بلایا اور کہا میں نے نجوم میں تیرا نصیبہ دیکھا۔ تو عنقریب کسی ملک کا بادشاہ ہونے والا ہے۔ جب تو بادشاہ ہو تو اقرار کر کہ میرا نام بھی اپنے ساتھ زندہ رکھے گا۔ حسن نے کہا میرے دن تیری کوشش سے پھرے ہیں میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر بادشاہ ہوا تو اپنا نام حسن کانگوئی بہمنی رکھونگا۔ اور میری اولادیں جب تک حکومت رہے گی سب یہی لقب جاری رکھیں گے۔

یہ اقرار مدار ہو چکے تو حسن شہزادے کے پاس رہنے لگا۔ چند روز کے بعد سلطان

غیاث الدین تغلق ایک مکان کے اندر مع اپنے چھوٹے ولی عہد شہزادے کے دب کر مر گیا۔ یہ مکان بڑے شہزادے نے جو حسن کا آقا تھا ایک ایسی ترکیب سے بنوایا تھا کہ جب ہاتھی اس کے دروازہ کے آگے آئیں تو مکان کی کل اندر سے دب جائے اور مکان گر پڑے۔

غیاث الدین تغلق مہم بنگالہ سے واپس آیا تو دلی کے باہر موضع افغان پور میں جہاں یہ مکان بنایا گیا تھا بڑے شہزادے نے باپ کی دعوت کی اور نذر کے ہاتھی پیش کئے جونہی ہاتھی سامنے آئے مکان گر پڑا۔ بادشاہ بھی مر گیا۔ ولی عہد شہزادہ بھی تمام ہو گیا۔ اور بڑے شہزادے کے سب مخالف بھی۔ اس کے بعد یہ بڑا شہزادہ سلطان محمد تغلق کے نام سے تخت ہندوستان کا مالک بنا۔ یہی وہ محمد تغلق ہے جو حسن کی حاضری کے دن فقیری بھیس میں حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ میں لنگر کھانے گیا تھا اور حضرت نے فرمایا تھا دیکھو بادشاہ جاتا ہے اور خلقت کو تعجب ہوا تھا۔

جب سلطان محمد تغلق مستقل بادشاہ ہوا تو حضرت محبوب الٰہی کا انتقال ہو چکا تھا آپ نے صرف دو مہینے اس کی حکومت دیکھی۔

محمد تغلق کو یہ جنون ہو گیا کہ دلی دکن میں جا کر آباد کرے اور اس نے دولت آباد کے نام سے ایک شہر وہاں آباد کیا تھا اور اکثر دکن جایا کرتا تھا اس کے ہمراہ حسن بھی دکن گیا اور وہاں کے ایک علاقے کا امیر ہو گیا۔

سلطان محمد تغلق دلی میں تھا کہ دکن میں کچھ بغاوت ہوئی یہ اس کے فرو کرنے کو خود آیا اس بغاوت میں وہ امرا تھے جن کو محمد تغلق سے اس کے ظلم وستم کے سبب دشمنی ہو گئی تھی کیونکہ محمد تغلق نے ہزاروں علماء مشائخ کو بے گناہ قتل کر ڈالا تھا اس واسطے خود اسی کے امراء اس سے باغی ہو گئے تھے ان میں حسن بھی شریک تھا۔

جب محمد تغلق اس بغاوت کو دبانے خود دکن آیا تو ان امراء نے جمع ہو کر اس کا مقابلہ کیا مگر مقابلہ کرنے سے پہلے تجویز کی کہ ایک آدمی کو اپنا بادشاہ بنا لو۔ کیونکہ مقابلہ ایک بڑے

سلطان کا ہے جب تک ہم میں بھی کوئی بادشاہ نہ ہوگا مقابلہ نہ ہو سکے گا۔

امیروں نے آپس میں قرعے ڈالے تو اسمٰعیل نامی ایک امیر کا نام نکلا اور سب نے اسکو سلطان ناصر الدین شاہ کے نام سے اپنا بادشاہ بنا لیا۔

لڑائی ہوئی تو ناصر الدین شاہ کو شکست ہو گئی اور قریب تھا کہ ان سب امیروں کا خاتمہ ہو جائے کہ یکا یک دلی سے خبر آئی کہ وہاں سلطان محمد تغلق کے ایک غلام نے بغاوت کی ہے اس واسطے سلطان اس مہم کو بیچ میں چھوڑ کر دلی چلا گیا اور ان امیروں کو موقع ملا کہ اپنی بادشاہت کو مضبوط کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے آس پاس کے تمام علاقے جہاں محمد تغلق کے حاکم حکومت کرتے تھے فتح کر لئے اور تمام دکن پر سلطان ناصر الدین کی حکومت قائم ہو گئی۔

نام تو سلطان ناصر الدین کا تھا مگر در حقیقت تمام فتح حسن کی محنت اور کوشش سے ہوئی تھی جس کا خطاب بھی سلطان نے ظفر خاں مقرر کیا تھا۔

حسن ظفر خاں کی کوششوں سے خوش ہو کر ایک دن سلطان ناصر الدین نے کہا لوگو میں بادشاہی کے قابل نہیں ہوں عقل ہمت شجاعت کے اعتبار سے حسن ظفر خاں اس لائق ہے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں۔ سب نے اس کو پسند کیا اور سلطان ناصر الدین نے اپنا تاج حسن ظفر خاں کے سر پر رکھ کر دکن کا بادشاہ بنا دیا۔

حسن نے تخت پر بیٹھتے ہی پہلا حکم یہ دیا کہ پانچ من سونا اور دس من چاندی حضرت محبوب الٰہی کی نیاز کے لئے فوراً ان کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ کی خدمت میں بھیجو جو خلد آباد دکن میں مقیم تھے۔

اس کے بعد اپنا نام سلطان علاؤالدین حسن گانگوئی بہمنی مقرر کیا سکے میں خطبہ میں فرمانوں میں یہی نام لکھا جاتا تھا اس کے خاندان میں سترہ اٹھارہ پشت تک دکن کی سلطنت رہی اور سب کے نام کے ساتھ گانگوئی بہمنی شریک رہا اور تاریخوں میں بھی اس خاندان کی حکومت کا نام بہمنی ہو گیا۔

اس طرح ایک انگلی نے روٹی کے ٹکڑے کو تاجداری مرحمت فرمائی۔

شامی ابدال کی کہانی

جولائی ۱۹۱۱ء کا ذکر ہے۔ راقم فقیر دمشق کے دارالسرور ہوٹل میں بیٹھا اپنے حجازی اخبار نویس سے باتیں کر رہا تھا جنہوں نے مکہ معظمہ میں الحجاز نامی اخبار جاری کیا تھا۔ گفتگو میں حجازی دوست نے کہا۔ جناب اخبار نویسی نئے زمانہ کا ہتھیار ہے ہم اس پر جتنا چاہیں فخر کریں۔ کیونکہ اس کے ذریعے ان دلوں کو فتح کر سکتے ہیں جن کو مفتوح کرنا تلوار بندوق سے ممکن نہیں۔ مگر پرانے زمانے کے ہتھیاروں میں دعا اور عمل کا ہتھیار سب سے بڑھ کر ہے۔ ابتدا میں مجھ کو ان پر عقیدہ نہ تھا۔ مصری کتب کے پڑھنے سے جو یورپین فلاسفروں کے خیالات کا ترجمہ تھیں میرے عقاید دگرگوں ہو گئے تھے۔ اتفاق کی بات ایک دن میں اپنے ایک خانگی قصہ کے سبب نہایت تشویش اور فکر میں تھا۔ میرے دل کی بے قراری حد صبر سے بڑھی جاتی تھی۔ میں صاف صاف کہتا ہوں مجھ کو عشق کا مرض تھا جس نے ہوش حواس بے ٹھکانے کر رکھے تھے۔ میرا مطلب ناجائز مطلوب نہ تھا۔ وہ میری بیوی تھی جس سے میں محبت رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے اور اس اندرونی اشتیاق کی قدر داں ہو۔ جس نے مجھ کو بے اختیار کر رکھا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دل میں کیا تھا۔ آیا وہ مجھ پر مہربان تھی یا نہیں مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ میری طرح اظہار کرنے والی نہ تھی۔ اس کی خودداری اور سنجیدگی نے مجھ کو شک میں ڈال رکھا تھا۔ دل کہتا تھا۔ یہ عورت مجھ کو خاطر میں نہیں لاتی۔

عشق جنون کی ایک شاخ ہے میرا دماغ طرح طرح کے تخیلات قائم کرتا اور خواب کی وہمی شکلیں بنا کر میری بے کلی کا سبب بنتا۔

آخر ایک دن تو ہمات کی صورت سامنے آگئی میں گھر میں گیا تو دیکھا ایک دوسری عورت بیوی سے باتیں کر رہی ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی مگر مجھے شبہ ہوا کہ یہ دوسری عورت ضرور اس کو بہکاتی ہوگی۔

جب وہ چلی گئی میں نے اپنی اہلیہ سے سوالات شروع کئے۔ اس نیک بخت بی بی نے کہا تم بدگمانی چھوڑ دو شرفا کے لئے یہ عار ہے کہ وہ اس قسم کی باتیں کریں۔ اتنا کہنا میرے لئے ستم ہو گیا۔ مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور کسی مرد کے خیال میں رہتی ہے میں نے دیکھا کہ گھر میں ٹھیرنا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ مجھ کو اپنے جنون سے ڈر تھا کہ کہیں وہ بڑھ کر کوئی ناشائستہ حرکت نہ کرا دے اس لئے میں گھر سے نکل کر باہر آگیا۔ یہ وہی پریشانی کا دن تھا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ بار بار خیال آیا تھا اس عورت کو طلاق دے دینی چاہئے مگر پھر سوچتا تھا کہ آخر اس کا قصور کیا دیکھا اور طلاق دینے کے بعد میں کیونکر زندہ رہ سکتا ہوں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ سامنے سے ایک شخص کھجوریں فروخت کرتا ہوا گزرا۔ یہ اجنبی آدمی تھا۔ یہاں سینکڑوں آدمی معاش کے لئے اسی قسم کی تجارت کیا کرتے ہیں مگر میرے دل پر اس شخص کی صورت نے بڑا اثر ڈالا۔ خیالات کی الجھن میں تسکین سی ہونے لگی میں نے اس کو آواز دی اور کھجوریں خریدیں اثنائے خریدمیں دریافت کیا۔ تم کون ہو اور کہاں کے رہنے والے ہو۔ کیا نام ہے کس جگہ قیام ہے؟

کھجور والے نے مسکرا کر کہا مجھ کو ان سوالات کے جواب کی فرصت نہیں ہے۔ اگر میری کھجوروں میں گھن یا کچھ خرابی نظر آئی ہے۔ تو تم اسکی بابت مجھ سے کہو ان سوالات سے کیا حاصل۔

میں نے کہا عربی اخلاق کے خلاف ہے۔ اگر تم مجھ کو جواب نہ دو کھجوروں میں کیا تو خرابی نہیں مگر کھجور والے میں نقص ضرور ہے۔

وہ بولا کھجور والے میں نقص ہے تو سمجھئے کہ بیوی میں نقص نہیں بیوی والے میں کچھ خرابی ہے

مجھ کو سکتہ ہو گیا۔ یہ اس نے کیا کہا۔ اس کو میرے حالات کا کیونکر علم ہو گیا۔ ضرور یہ کوئی ولی اللہ اور صاحب کشف ہے۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ان کو کھینچا اور اپنے دل پر رکھ لیا جو زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کھجور والے نے مجھ کو گھور کر دیکھا اور ہاتھ چھڑا لئے۔ اسکی صورت بہت ہیبتناک ہو گئی تھی آنکھوں سے شعلے نکلتے معلوم ہوتے تھے۔

اس کو غضبناک دیکھ کر میں نے عاجزی سے کہا۔ بزرگ انسان معاف کریں اپنے بس میں نہیں ہوں میرے ہوش کو عشق کے سانپ نے ڈس لیا ہے یہ سنکر وہ کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا تیرا وہم غلط ہے وہ پارسا ہے تجھ پر فدا ہے۔ مگر منہ سے نہیں کہتی۔ بریس سیدی بلال (حضرت بلال کے سر کی قسم) تیری بیوی عورت نہیں ہے۔ مردان غیب میں سے ہے میں نے اس کو دونوں بدلوں کے ساتھ پرواز کرتے دیکھا ہے۔

دو ابدال اور پرواز کے الفاظ نے مجھ کو پھر متعجب کیا مگر دریافت کی مجال نہیں تھی۔ حیرت سے منہ تکنے لگا۔ بزرگ نے خود ہی فرمایا کیا تم نے حدیث رسول صلعم میں نہیں پڑھا کہ ابدال خدا تعالےٰ کی ایک مقبول جماعت ہے جن کا قیام عموماً شام کے ملک میں رہتا ہے اور ابدالوں کو خدا نے بڑی بڑی طاقتیں دی ہیں۔ وہ آن کی آن میں لاکھوں کوس اڑ کر جا سکتے ہیں۔ ان کو کشف الغیب کا کمال عطا ہوتا ہے۔ تمہاری بیوی کا باپ بھی ابدال تھا عورت کو یہ رتبہ نہیں مل سکتا ورنہ باپ کی موت کے بعد یہ جانشین ہوتی۔ تاہم اسکی روح میں وہ لطافت موجود ہے کہ ابدال کے ساتھ پرواز کر سکتی ہے۔ اتنا کہہ کر کھجور والے بزرگ نہایت تیزی و پھرتی سے چلدیئے اور بت بنا کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

اسی استعجاب اور حیرانی میں گھر آیا۔ دیکھا بیوی مسکرا رہی ہے اب میں اس سے ڈرنے لگا میں لے پیار کی نظریں نہیں خوف و ادب کی نگاہ سے اسکو دیکھا اور کہا تمہارے مسکرانے کا کیا سبب ہے۔ بولی اگر انسان اڑ سکتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تو لئے دہی نے پرواز کی۔ میں نے کہا سمجھ میں نہیں آیا۔ صاف صاف کہو کہنے لگی کھجور والے نے جو کچھ کہا اس سے یہ نہ سمجھنا کہ آدمی پرواز

کر سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ اسکی بعض طاقتیں پرواز کرتی ہیں میں خوش ہوں کہ تمہارے وہم اور شک و شبے نے کھجور والے کی باتوں سے پرواز کی اور اب تم مجھ پر بدگمان ہونا چھوڑ دوگے۔

بیوی کے مکاشفہ نے مجھ کو بالکل مبہوت کر دیا۔ پریشان تھا کہ الٰہی یہ کیا ماجرا پیش آیا ہے لیکن میں نے کہا یا حبیبہ براس سیدی بلال۔ آگے کا لفظ زبان سے نہ نکلا تھا صرف بلال تک کہنے پایا تھا کہ بیوی نظروں سے غائب ہو گئی۔ اب تو مارے خوف کے میری بری حالت تھی سہم کر بیٹھ گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں تھوڑی دیر میں آنکھ کھولی تو بیوی سامنے بیٹھی تھی۔ مگر وہ بھی چپ تھی۔ اور میں بھی خاموش تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈرتے ڈرتے میں نے اس تماشے کی حقیقت دریافت کی۔ اس نے کہا یہ راز تم کو دمشق میں سیدی بلال سے معلوم ہوگا۔ وہاں جاؤ۔ وہ سیدی بلال رضہ صحابی رسول صلعم کے مزار پر جمعے کے دن ملیں گے۔ حجرہ کی ٹوپی ان کے سر پر ہوگی اور پوستین پہنے ہوئے ہونگے دیکھو تو سلام کرنا اور خاموش سامنے بیٹھ جانا۔ کچھ دریافت کریں تو مختصر جواب دینا اپنی طرف سے دخل در معقولات نہ کرنا۔ یہ ارشاد ہو کہ کوئی مراد و مقصد ہے تو سلامتی ایمان و محبت رسول و آسائش زندگانی مانگنا۔

اہلیہ کے اس بیان و مشورہ سے اور مذکورہ عجیب و غریب مشاہدے سے سفر دمشق کا شوق دامنگیر ہوا اور میں سیدھا یہاں آیا اور حسب ہدایت جمعے کے دن سیدی حضرت بلال مؤذن رسول خدا صلعم کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں دیکھا کہ دو شخص اسی لباس کے ہیں جن کا پتہ بیوی نے دیا تھا۔ اور دونوں کی شکلیں بھی قریب قریب یکساں ہیں۔

میں چکرایا کہ الٰہی ان میں میرے مقصود کون سے بزرگ ہیں تاہم میں نے دونوں کو سلام کیا اور ادب کے ساتھ گردن جھکا کر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں اول تو کچھ دیر مجھ کو بغور دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ان میں سے ایک صاحب نے کہا پڑھو خلق السموات والارض بالحق یکور اللیل علی النہار یکور النہار

علی اللیل وسخر الشمس والقمر (اس نے آسمانوں اور زمین کو مصلحت حقانی سے پیدا کیا وہی رات کو دن میں لپیٹ دیتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور چاند وسورج کو مسخر کر دیا ہے) میں نے تیئسویں پارہ کی سورہ زمر کی آیت پڑھی پڑھتا تھا کہ ان دونوں کے سر غائب ہو گئے ہیں۔ ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ قریب تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں۔ یکایک دیکھا ان کے سر موجود ہیں۔ آواز آئی ہم نے تیری بیوی سے شکایت کی کہ اس کمزور دل والے کو کیوں بھیجا۔ اب میرے بدن میں رعشہ تھا۔ زبان بے قابو تھی۔ ہر چند چاہا کہ کچھ بولوں۔ مگر بولا نہ گیا۔

آخر وہ خود ہی بولے۔ ہم دونوں ابدال ہیں ہمارا نام بلال ہے۔ ہم اسرار الٰہی کے نشان ہیں ہمارے وجود خاکی ہیں لیکن اربع عناصر سے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ خاک۔ باد آب۔ آتش۔ ہمارے زیر فرمان ہیں۔ جوہر لطیف ہم کو دیا گیا ہے۔ مانگ کیا مانگتا ہے کیا کہنا چاہتا ہے۔

اوسان باختہ تھے بے اختیار منہ سے نکلا "علم حب کا طلب گار ہوں"

یہ سن کر دونوں نے کہا۔ آسف آسف (افسوس افسوس) اچھا۔ سورۂ اخلاص یکسو ایک بار پڑھ لیا کر۔ اتنا کہا تھا کہ غائب ہو گئے۔

بہت دیر تک میرے اوسان درست نہ ہوئے آخر بہ ہزار دقت وہاں سے اٹھا اور قیام گاہ پر آیا اور اسی دن بیکے معظم روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچا تو بیوی کو صاحب فراش پایا۔ سخت بخار میں مبتلا تھی۔ دو چار روز علاج ہوتا رہا مگر جاں بر نہ ہو سکی اور انتقال ہو گیا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن تین۳ بار دمشق آچکا ہوں۔ کوئی جمعہ آستانہ حضرت بلالؓ کی حاضری سے ناغہ نہیں کرتا۔ مگر پھر کبھی ان بزرگوں کی صورت نظر نہ آئی۔ سورۂ اخلاص کا ورد جاری ہے جب کبھی اس کے آزمانے کا موقع آیا۔ جب تسخیر کے لئے تیر بہدف پایا۔ یہ ان ابدالوں کی زبان کا اثر ہے اب میں نے دوسری شادی کر لی ہے لیکن گذشتہ زندگی کے عجائبات آنکھوں سے دور نہیں ہوتے اس دن سے میں نے جانا کہ واقعی دعا و عمل میں بڑی تاثیر

ہوتی ہے۔ اگر میں اپنی بیوی کے کہنے پر عمل کرتا اور ابدالوں سے اسکی بتائی ہوئی باتیں مانگتا تو آج کو دین و دنیا کی دولت سے مالا مال ہو جاتا مگر قسمت میں یہ نہ تھا۔

حجازی دوست کی یہ عجیب و غریب داستان سن کر دوسرے دن مجھے کو راقم فقیر دوبارہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضر ہوا۔ دل کہتا تھا۔ کاش میں بھی ان ابدالوں کی زیارت سے مشرف ہو جاؤں۔ لیکن یہ شرف آسانی سے ملنے والا نہ تھا۔ اس لئے محروم واپس آیا۔

(حیف و حسرت)

آنسو کی کہانی

آون آون کہہ گئے۔ ور آئے نہ بارہ ماس ساون گزر گیا بھادوں گذرا جاتا ہے بہار کے دن ختم ہو جائیں گے۔ جب وہ آئیں گے۔؟

پردیس جا کر خبر نہ لی۔ خرچ نہ بھیجا۔ خط نہ لکھا۔ کھانے کا فکر کروں ان کے نہ آنے کا صدمہ اٹھاؤں۔ موسم برسات کی کالی گھٹاؤں کو دیکھ دیکھ کر کڑھوں ایک نہیں بے شمار بھائیں دل میں لگی ہوئی ہیں۔

میں گل رخ بیگم مرزا سلیم خلف معین الدین اکبر شاہ بادشاہ کی نواسی دلی کی رہنے والی ۱۹۱۶ء کی ہریالی برسات اور اپنے پی کی جدائی میں یہ بیان لکھواتی ہوں۔

اماں جان کی ایک اکلوتی لڑکی ہوں جن کو مرے ہوئے ڈیڑھ برس کا عرصہ گزرا۔ غدر میں ہمارا گھر لوٹ سے بچ رہا تھا۔ یا یوں کہو خدا نے بچا لیا تھا کیونکہ زیور اور نقدی جو اماں نے دفن کر دی تھی اسکو کسی نے کھود کر نہیں نکالا ورنہ اوپری لوٹ تو ہمارے ہاں بھی ہوئی تھی۔

میری پیدائش غدر سے چالیس برس پیچھے کی ہے۔ غدر میں اماں جان دس سال کی تھیں بیس سال کی عمر میں انکی شادی ہوئی اور دس برس بعد خدا نے مجھکو ان کے ہاں پیدا کیا۔

میرے ابا صاحب لوگوں کو اردو فارسی پڑھاتے تھے اور اس سے پچاس ساٹھ روپیہ

ہر مہینے کما لیتے تھے مگر اماں ایسی شاہ خرچ تھیں کہ ابا کی تنخواہ دو چار دن سے زیادہ ان کے ہاتھ میں نہ ٹھیرتی تھی۔

خیال کرو مجھ اکلوتی کا کیسا لاڈ پیار ہوگا۔ اماں تو خیر پروانہ ہوا چاہئیں۔ ابا کا یہ عالم تھا کہ میرے دیکھے بغیر حلق سے نوالہ نہ اترتا تھا۔

مجھے یاد ہے اماں ابا کی سلامتی تھی، برسات کا ناآنا یا۔ گھر میں کھم گڑے۔ ہم جھولے ہمسائے کی لڑکیاں جھولیں۔ اور آخر ایک دن اپنی پلی ہوئی بلی کا دھوم دھام سے جھولا کیا، مہمانداری ہوئی، رنگین پٹریاں اور رنگین رسے آئے اور اس میں ہماری خالہ بلی کو جھولایا گیا۔ اماں کہتی تھیں بلی کے جھولے میں سو روپے مہمانداری میں خرچ ہوئے تھے۔

ایک وہ دن تھا کہ میری بلی کے جھولے کی یہ دھوم تھی۔ آج یہ وقت ہے کہ میں خود جھولے کو اور شام کے کھانے کو ترستی ہوں۔

میری بپتا بڑی دردناک ہے۔ اماں نے جس شخص سے میرا نکاح کیا تھا وہ بڑا نیک اور کم سخن تھا اور میں انصاف سے کہونگی کہ اب بھی وہ ایسا ہی ہے مگر فقیری اور درویشی کے شوق نے اس کو میرے ہاتھ سے کھو دیا۔ شادی کے چھ مہینے بعد اماں مر گئیں۔ ابا پہلے مر چکے تھے اور اماں کے مرتے ہی خاوند کہیں چلے گئے۔ چلتے وقت کہا تھا اجمیر شریف چلہ کرنے کو جاتا ہوں چالیس روز بعد آجاؤں گا۔ چالیس دن چھوڑ ایک برس سے زیادہ ہو گیا انکی نہ خبر ہے نہ خیر ادھر میرا یہ حال ہے کہ خاوند کے جانے کے بعد بھیتے میں مبتلا ہوئی۔ زندگی تھی بچ گئی پھر چوری ہوئی اور گھر میں ایک تنکا باقی نہ رہا۔ فاقوں کی نوبت آئی تو قدیمی محلہ چھوڑ کر ایک اجنبی محلے میں جا کر رہنے لگی۔ پہلے کرایہ کا مکان لیا پھر اسکو چھوڑ کر کھانا پکانے کی نوکری کر لی اول جن کے ہاں نوکر ہوئی وہ عیسائی مذہب کے تھے۔ خاوند ریل میں نوکر تھا اور بیوی مدرسے میں پڑھاتی تھی۔ یہ دونوں دیسی کھانا کھاتے تھے میں دو روپے اور کھانے پر انکے ہاں تین مہینے رہی۔ اس تین مہینے میں کم سے کم دس بارہ دفعہ صاحب خانہ نے مجھ کو بیوی سے

مارا کیونکہ وہ بہت بدمزاج تھی لڑتی اپنے خاوند سے اور غصہ آتا تھا مجھ پر۔

ایک دن میں نے خواب دیکھا کہ حضرت اکبر شاہ بادشاہ لال قلعے میں تخت پر بیٹھے ہیں اور میرے نانا میرزا سلیم سامنے کھڑے ہیں میں دربار کے سامنے ایک باورچی خانہ میں پتیلی مانجھ رہی ہوں اور ایک عورت مجھ کو بید سے مارتی جاتی ہے۔ نانا بادشاہ سے کہتے ہیں دیکھئے میری اولاد کیسی مصیبت میں ہے اس پر اکبر شاہ نے دعا کو ہاتھ اٹھائے اور بید مارنے والی عورت پر بجلی گری جس سے وہ اسی وقت پھڑک کر مر گئی۔

آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ابر آیا ہوا ہے بجلی چمک رہی ہے۔ کالی میم صاحبہ (کیونکہ وہ ذات کی چمار تھی) اپنے خاوند سے لڑ رہی ہیں یکایک وہ باورچی خانہ میں آئیں اور مجھ سے کہا کب تک سوؤ گی۔ نہ چاء کی خبر ہے نہ ناشتہ کی۔ میں نے کہا ابھی پکاتی ہوں آپ چلئے میں لاتی ہوں آٹھ بجنے کو آئے تمہاری ابھی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں نے کہا آدمی ہوں رات کو بارہ بجے سوئی بارش کے سبب چھپا ٹپکتی رہی جس نے سونے نہ دیا۔

کالی میم صاحبہ بگڑ کر بولیں ہم کچھ نہیں جانتے تم کو سویرے اٹھنا چاہیے میرے منہ لگا آدمی ہوں لوہا نہیں ہوں۔ یہ سنکر انہوں نے بید لی اور مجھ کو خوب مارا۔ جب وہ مار کوٹ کر کمرہ میں گئیں میں نے چاء کا سامان کیا اور خدا سے رو رو کر کہنا شروع کیا۔

"الٰہی میں ہندوستان کے شہنشاہ کی اولاد ہوں۔ الٰہی تو عزت داروں کو ایسا تو ذلیل نہیں کیا کرتا۔ یہ موئی چمارن مجھ کو ذرا سے قصور پر اتنا مارتی ہے اور تو اسکو سزا نہیں دیتا۔ تیری شان ہے کل جو ہمارے محلوں کے قریب نہ آسکتے تھے آج میں ان کے ہاتھ سے جوتیاں کھاتی ہوں۔"

یہ کہہ رہی تھی کہ زور سے تڑاخا ہوا بجلی کوٹھے پر گری جس سے کالی میم صاحبہ کا کام تمام ہو گیا سارے محلہ میں غل مچ گیا۔ پولس والے آ گئے۔ افسر آ گئے۔ آخر پادری صاحب آئے اور جنازہ لے گئے۔ دوسرے دن پادری صاحب پھر گھر میں آئے اور مرنے والی کے خاوند سے

پوچھا وہ کیا گناہ کرتی تھی۔ انہوں نے کہا مجھ سے لڑتی تھی اور اپنی ماما کو مارتی تھی۔

پادری صاحب نے مجھ کو بلایا اور کہا تم مرنے والی کو معاف کر دو۔ عیسائی مذہب بہت رحم کا مذہب ہے۔ یہ اس کی ذاتی خرابی تھی۔ ورنہ عیسائی مذہب نے اپنے ظلم سے بہت منع کیا ہے۔

میں نے پادری صاحب کے کہنے سے مرنے والی کو معاف کر دیا اور چند روز تک امن سے رہی اسی اثنا میں صاحب کی بدلی ہوگئی اور وہ کہیں باہر جانے لگے مگر میں نے دلی سے جانا منظور نہ کیا اور نوکری چھوڑ کر پڑوس میں ایک تیلی کے ہاں جا رہی جسکی بیوی سے میرا اخلاص ہوگیا تھا لیکن یہاں میں نے تیلی کی نیت خراب دیکھی تو اس گھر کو بھی چھوڑ دیا اور ان نابینا مولوی صاحب کے ہاں چلی آئی۔ یہ میرے والد کے ملنے والے ہیں بس و یہ چھ مکانوں کا کرایہ آتا ہے اکیلے آدمی ہیں بڑھاپے میں ان کو بھی ایک اچھی خدمت گزار کی ضرورت تھی۔ اور میں بھی ایک امن و آسائش کا گھر چاہتی تھی جہاں عزت اور عصمت سے بسر کر سکوں۔

یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے مگر آدمی ہوں دل رکھتی ہوں دلی میں ہنسی کھیل برسات کا زمانہ بڑی خوشی سے کاٹا جاتا ہے۔ قطب صاحب کی سیر ہوتی ہے پکوان پکتے ہیں۔ جھولے پڑتے ہیں۔

مجھ کو ان میں سے کچھ نصیب نہیں۔ روتی ہوں آنسوؤں کا جھولا ڈالتی ہوں اور ان میں جھولتی ہوں۔ میرا درویش خاوند میرا صوفی شوہر خدا کی یاد میں سرشار ہے اور اس نے مجھ کو اپنی یاد سے بھلا دیا۔ میں اس پر الزام نہیں رکھتی۔ میں اس سے بیوفا نہیں ہوتی میں اس کی یاد کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتی۔ میں اس کے پاک اور خدا پرست دل کی خاطر ساری جوانی پاک خیال میں بسر کرنے کو تیار ہوں مگر اتنا کہنا میرا فرض ہے کہ گھر اور بیوی کے حقوق سے بے خبر ہو جانا درویشی نہیں ہے۔ رسول خدا صلعم اور صحابہ کے حالات میں اور بعد کے تمام بزرگوں کے واقعات میں ایسی کوئی

کیفیت موجود نہیں جس سے ترکِ دنیا کا یہ مطلب نکلتا ہو کہ بال بچوں اور بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔
مجھے یقین ہے کہ میرے خاوند نے مجھ کو نہیں چھوڑا۔ ان کے دل میں میری یاد موجود ہوگی کیونکہ میرے دل پر اس کا اثر پڑ رہا ہے میں تو اور صوفیوں کی یادداشت کے لئے اپنے آنسو کا یہ چھوٹا موتی رسالے میں چھپواتی ہوں۔ تاکہ میری طرح جس جس کا دل غمگین و افسردہ ہو وہ آنسوؤں کے چھوٹے چھوٹے میٹھے چھوٹے لے اور یہ گیت گائے۔ مدینہ کے اچھے بابل نے میرے واسطے کہیں گر والے ہیں اور صبر و ہمت کا جھولا ڈلوایا ہے جس میں جھولتی ہے دنیا کو بھی یاد رکھتی ہے اور دین کو بھی۔

فرنیچر مرچنٹ کی کہانی

جب میں برق اور اس کے کارناموں سے بے خبر دار نہ تھا۔ ٹرام گاڑی بجلی کی روشنی بجلی کے پنکھے اور بجلی کی خط و کتابت کا خیال خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ میرے نام فرنیچر مرچنٹ یعنی اسباب آرائش کے سوداگر کا ایک تار پہنچا۔
یہ پہلا تار تھا جس کو میں نے شہر کی سکونت اختیار کرنے کے بعد پڑھوا کر سنا تھا۔ اپنے گاؤں کے پٹواریوں سے سمدھیوں اور بچوں کے سسرال والوں کو اکثر خطوط لکھوائے تھے۔ وہ ہمیشہ بادامی رنگ کے چوڑے چکلے کاغذ پر لکھے جاتے تھے۔ ان میں اتنا مضمون ہوتا تھا کہ میں لکھواتے لکھواتے اور پٹواری لکھتے لکھتے تھک جاتے تھے۔ میری بیوی گرم آفتاب کر فارغ ہو جاتی۔ دودھ بلو لیتی۔ روٹی پکانے بیٹھ جاتی مگر میرا خط ختم نہ ہوتا۔ مگر اس تار کو سنا تو حیران رہ گیا کیسا مختصر مضمون تھا۔

مسٹر خیراتی خاں — چاندنی چوک دہلی

دس ہزار روپے کا سامان آپ کی فرمائش سے روانہ کر دیا گیا ہے بلٹی کا ڈاک پی جلد وصول کیجئے۔ منیجر کنگ کنگ اینڈ کو کلکتہ۔

میری حیرت ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ دوست آ گئے جنہوں نے کنگ کنگ کمپنی کی فہرست دکھا کر مجھ کو اس سامان آرائش کا شوق دلایا تھا۔ اور میں نے انہی کی معرفت سوداگر مذکور سے یہ اسباب منگایا تھا۔
ان دوست کے آتے ہی میں اپنے ماچے (گاؤں کا بڑا پلنگ) سے کھڑا ہو گیا اور تازی چھاچھ اس کے واسطے منگائی جو مٹی کے ایک کٹورے میں آئی۔

اس کے بعد تانگہ کا ذکر آیا۔ وہ دوست بولے۔ اب دیکھنا تم شریف آدمی بن جاؤ گے یہ باجہ اور پیتل کٹورہ تم جیسے دولت مند آدمی کے لئے بڑا دھبہ ہے تمہاری شان تو یہ ہے کہ ایک آرام کرسی پر لیٹے ہو۔ آس پاس دس بیس کرسیاں پڑی ہوں۔ ملنے والے آئیں ان پر بیٹھیں اور نوکر چھاچھ کی جگہ سوڈا اور لیمونیڈ کھول کھول کر کانچ کے گلاسوں میں ان کو دیں۔ یہ دیہاتی باتیں اس زمانہ کے بیٹھنے والے کو ہرگز زیبا نہیں ہیں۔

(۲)

مسٹر خیراتی دولت پور کے زمیندار تھے۔ ان کے باپ ایک لاکھ روپیہ نقد چھوڑ گئے تھے انہوں نے اس روپے سے اور علاقہ خریدی اور ایسے چلن سے چلے کہ باپ سے چار حصہ زیادہ ان کی زمینداری ہو گئی۔

اتفاق سے دہلی میں الوداع کی نماز پڑھنے آئے تھے یہاں آ کر جو شہر کی بہار دیکھی تو گاؤں کی زندگی دوزخ نظر آنے لگی۔ گھر جا کر بیوی بچوں کو ساتھ لیا اور چار چھکڑے اسباب خانہ داری کے لے کر دہلی میں رہنے کو چل کھڑے ہوئے اور زمینداری کارندوں پر چھوڑ دی۔

دہلی میں ایک بڑا مکان پچیس روپیہ ماہوار کرایہ پر لیا اور اپنے دیہاتی گھرداری کے سامان کو لا کر اس میں لگا دیا لیکن ان کے دیہاتی مکان کی سی اس شہری مکان میں کہاں گنجائش تھی بہت بے ترتیبی سے وہ چیزیں اس میں آئیں۔

پڑوس میں ایک نئی روشنی کے جنٹلمین رہتے تھے انہوں نے جو سنا کہ یہ بڑا پیسے والا زمیندار ہے اور نیا نیا شہر میں آیا ہے تو اس کے پاس آنے جانے لگے اور چند روز میں اسکو نئی تہذیب کے سامان کا مشتاق بنا دیا اور دس ہزار روپے کی فرمائش کلکتہ بھجوا دی۔

(۳)

مسٹر خیراتی کا پرانا اسباب کوڑیوں کے مول نیلام ہو گیا اور ان کے گھر میں ولایتی ٹیپ ٹاپ سجا دی گئی۔ یہ سب کچھ تو ہوا مگر غریب خیراتی کو ان کا برتنا آتا تھا۔ ایک دن

جو ان کے دوست آئے تو دیکھا کہ خیراتی کا لڑکا شیشہ کے جگ سے آبدست کر رہا ہے اور پاخانے کے پاٹ میں اس کی نوکرانی دودھ لوٹ رہی ہے۔

دوست نے پھر کچھ دینا شروع کیا اور انگریزی چیزوں کا استعمال سکھایا اور کہا چلو تم کو کہیں کا سفر کراؤں جب تم کو تجربہ ہوگا۔

مسٹر خیراتی کہتے ہیں کہ میں ان دوست کے ہمراہ ہی گیا ہم نے سیکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ خریدے اور سوار ہوگئے۔ جب مجھ کو بیت الخلا کی ضرورت ہوتی تو اپنے دوست سے پوچھا کہ میں جنگل کہاں جاؤں۔ انہوں نے غسل خانہ بتادیا میں اندر گیا۔ وہاں چینی کی ایک سیلاپچی آئینہ کے نیچے رکھی تھی اور دوسرے کونہ میں ایک اور پایہ سا رکھا تھا مگر اس کا منہ تختے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں سمجھا کہ پاخانہ یہی سیلاپچی ہے۔ بڑی مشکل سے اور پر چڑھا کیونکہ وہ اونچا لگی ہوئی تھی۔ اور سخت وقت سے اس پر بیٹھا اور حاجت سے فراغت حاصل کی لیکن دل میں نئی روشنی کو گالیاں دیتا جاتا تھا کہ پاخانہ صاف تو خوب ہے پر اونچا اس قدر ہے کہ اس پر چڑھنا محال ہے۔ وہ ہمارے جنگل کی سی آسانی نہیں ہے!

فارغ ہو کر باہر آیا تو دوست سے اس کی شکایت کی وہ اندر جا کر خفا ہوتے ہوئے واپس آئے اور بولے بڑے نامعقول ہو منہ دھونے کے برتن میں یہ کیا حرکت کرگئے۔ غرض ہم دونوں نے بڑی مشکل سے اس دیہاتی سخت چیز کو پانی سے ریزہ ریزہ کر کے بہایا۔

(۴)

پانچ سال کے بعد مجھے سب کچھ آگیا۔ یہاں تک کہ میں اپنے استاد کے بعض فیشنوں پر اعتراض کرنے لگا جس سے وہ اکثر اوقات جھینپ جاتے تھے کہ میں جاہل ان سے بڑھ کر آداب تہذیب پر عمل کرلیتا تھا۔

یہ تو ہوا کہ میں جنگلی جانور سے آدمی بن گیا مگر اس میں میری تمام جائداد برباد ہوگئی خرچ کی زیادتی سے مقروض ہوا۔ اور رفتہ رفتہ ساری زمینداری مہاجنوں کے قبضے میں چلی گئی۔

گھر کا فرنیچر بھی نیلام ہونے لگا۔

ایک دن میرا قرق شدہ اسباب نیلام ہو رہا تھا کہ ایک صندوقچہ میں سے نکال کر تار کا ایک لفافہ نیلام کنندہ نے پھینک دیا۔ اب میں انگریزی بھی سیکھ گیا تھا۔ جب میں نے اسکو پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ فرنیچر کے تاجر کا پہلا تار ہے۔ جو شروع میں میرے نام آیا تھا اور دس ہزار روپے کے مال بھیجنے کی اطلاع تھی۔ اس کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور سیدھا میں پہنچا اور اس تار کو چھپوا دیا تاکہ نئی روشنی کی وہ تمیز داری جو فضول خرچی سکھا کر برباد کرتی۔ اس شعلے سے جل کر خاک ہو جائے۔

رُوح کے خول کی کہانی

ہستی کا ناسوت اور لاہوت

تربوز کا چھلکا سبز گودا سرخ مزا جو اسکی روح ہے میٹھا۔ مگر مٹھاس کی شکل دیکھی نہیں چکھنے سے جانی۔ آم کا چھلکا سبز، رس زرد، مزا شیریں۔ وہی اسکی جان ہے جس پر آدمیوں کی جان قربان ہے۔

چاہے سب جان و روح کو میں مگر ہاتھ میں فقط اس کا خول آتا ہے۔ کمہاری ایک چھوٹا سا پردار کیڑا ہے۔ بھڑ سے ذرا دبلا پتلا۔ گھروں میں گیلی مٹی سے اپنا گھونسلا بناتا ہے اور اس میں جھینگر مار کر اسکی لاش چھپا دیتا ہے۔ اور دروازے میں خود بیٹھ کر روح کے خول کو توجہ دیتا ہے۔ چند روز میں اس کے مراقبے کی طاقت جھینگر کو زندہ کر دیتی ہے اور صحبت ہم نشینی کا اثر بے رونق جھینگر کو خوبصورت کمہاری کی شکل بنا دیتا ہے اور جھینگر کمہاری بن کر اڑ جاتا ہے۔

توجہ اور مراقبے کی یہ برکت دیکھ کر اور جسم کی ماہیت میں یہ انقلاب مشاہدہ کر کے میں نے ایک دن جو ستمبر ۱۹۱۵ء کا آخری حصہ تھا شملے کے پہاڑ پر اپنے خول کا مراقبہ شروع کیا

اور اپنی لاش پر نظریں جمائیں۔ کمہاری نے جس دن جھینگر کا شکار کیا اس کے ڈنک مارے تو اسکی تڑپ اور پھڑک سے ایک لالہ جی صاحب کا جی بہت دکھا تھا۔ اور انہوں نے کمہاری کو ہتیاری جانور کا خطاب دیا تھا اور میں نے بھی جو اس وقت تک خواجہ حسن نظامی تھا۔ مظلوم جھینگر کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی۔

یہی واقعہ آج پیش آیا میرے خول کو میرے مرنے کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس کے صدمے میں نے بھی ہمدردی ظاہر کی۔ مگر جو نعمت مجھ کو اس فرقت و زحمت میں نظر آتی تھی۔ اس سے اوسان درست تھے اور اطمینان سامنے تھا اس لئے میں نے اپنے خول سے رسماً غمخواری کا اظہار کیا اور اسکی وہ کہانی سن لی جو اس نے دم توڑتے وقت جی بہلانے کو مجھ سے کہی۔

نشے کی کہانی

پہلے میرے خول نے ایک ایسی کہانی کہی جس کو میں سکرات کے نشہ کی نشانی سمجھا اور پہاڑ کے ایک پیارے پھول کی پنکھڑی پر لیٹ گیا اور اسکی بہکی بہکی باتوں کو متانت اور سنجیدگی سے سننے لگا۔

خول نے کہا برا ہوا اس عبادت کا جس نے چڑیا کی جان لی۔ خواجہ پیارے آج سے دس ہزار برس پہلے اس پہاڑ پر ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک عبادت گزار جوگی رہتا تھا۔ ایک دن اس نے اپنے خیال کو خالق کے خیال سے لگایا اور چاہا کہ اس کا نور دیکھے کہ ایک چڑیا چڑچڑاتی پروں کو پھیلاتی پھدکتی چیں چیں کرتی اس کی جھونپڑی میں آ گئی۔ چڑا اس کے ساتھ تھا اس نے اپنی لیڈی سے محبت کی گفتگو شروع کی اور کہا پیاری دانہ چگ چکیں آؤ اس فقیر کی تونبی پر چلکر بیٹھیں جس میں یہ پانی پیتا ہے اور باتیں کریں چڑیا اچھلی اور مستانہ ادا سے دو تین جھٹکے ہوا میں کھائے اور تونبی پر جا بیٹھی۔

چڑے نے کہا یہ آدمی کیا چاہتا ہے۔ چڑیا بولی اپنے خول کی خواہشوں سے درگزر اور نورِ حق
تک رسائی۔ چڑا اچھلا کر بولا۔ دیوانہ ہے خول ملا ہے تو اسکی خواہشوں کو بھی پورا کرنا پڑے گا۔ نورِ حق
خواہشوں سے جدا تھوڑی ہے۔

جوگی کو سونے چین چین کے غل نے اور کچھ سنائی نہ دیا اور اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر ان دونوں
پر کھینچ مارا۔ جو چڑے کے سر میں لگا اور وہ بیچارہ تڑپ کر زمین پر گر پڑا اور مر گیا۔ چڑیا یہ دیکھ کر
پھر سے اڑ گئی اور باہر درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر
دیکھتی تھی۔ اور اپنے خول کے بچ جانے پر شکر کرتی تھی مگر تھوڑی سی دیر کے بعد اس کے دل کو شوہر
کی محبت نے بے قرار کیا۔ وہ الفت کے غم میں اندھی ہو گئی۔ اسکی روح اپنے خول میں سر پٹخنے اور
پھڑ پھڑانے لگی جس کے صدمہ سے اس کا خول بھی حرکت میں آ گیا اور روح کے اندرونی اشارے سے
مجبور ہو کر چڑیا پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔ وہاں اس کے غریب چاہنے والے چڑے کی لاش خاک میں
پڑی تھی اور فقیر اپنے خول کو توجہ دے رہا تھا۔ چڑیا نے آہ و نالے شروع کئے۔ کبھی وہ ٹوپی پر
آتی کبھی جھونپڑی کے بانس پر جاتی۔ اسکی زبان تالو سے لگی تھی وہ چیختی تھی اور بلبلاتی تھی۔

جوگی کے خیال میں پھر خلل پڑا۔ اس نے ایک وحشت کی اور چڑیا کو بھی ڈنڈے سے مار ڈالا۔
عاشق و معشوق کی لاشیں اٹھا کر جھونپڑی کے باہر پھینک دیں اور ایک لمبا سا سانس لے کر
جس سے تضیع اوقات کا صدمہ ظاہر ہو رہا تھا۔ پھر مراقبے میں بیٹھ گیا۔

باہر چڑے چڑیا کے جنازے رکھے تھے۔ اندر جوگی اطمینان سے گردن جھکائے بیٹھا تھا کہ
نورِ حق ہاتھ میں شعلے کی تلوار لئے نمودار ہوا۔ جوگی اسکو دیکھ کر سجدہ میں گر پڑا اور اسکی روح
اپنے مرکز پر قربان ہونے کو خول میں پھڑ پھڑانے لگی۔ مگر نورِ حق نے جوگی کے خول پر شعلے کا ایک
ہاتھ مارا اور کہا۔ میری چڑیوں کو خون کیوں کیا جو فطرت کا سبق سنانے تجھ تک آئی تھیں۔
ان میں زندگی تھی۔ وہ نسل بڑھانے کے دو پتلے تھے۔ تیرے ترک وجود سے ان کا وجود بہتر تھا۔
جوگی کے خول نے عاجزی سے معافی مانگی۔ مگر اندر کی روح نے اپنے باپ نورِ حق کو

ترشی سے جواب دیا اور کہا مجکو یہاں قید کر کے آپ آزاد رہنا چاہتا ہے تو بھی اس قفس کا مزا چکھ دنیا میں تھوڑے پنجرے ہیں جنکے اندر کی ارواح تیری فطرت کا حکم مانتی ہیں، ایک میں اگر تعمیل نہ کروں تو کیا نقصان ہوگا۔

نور حق نے یہ سنکر اندر کا سانس لیا اور جوگی کی روح ایک سناٹے کے ساتھ ہاتھ پھیلائے کھنچکر اڑتی ہوئی نور حق میں سما گئی۔

جوگی کا خول پڑا رہ گیا۔ اور جھڑیوں کے خول سے زیادہ اس نے جنگل کو بدبودار کیا۔

جب میرا خولی نسبتی کہانی کہہ چکا تو میں نے کہا۔ کہہ چکا یا کچھ باقی ہے۔ گھبرا مت۔ میں تجکو سڑنے سے بچاؤں گا۔ اور اس جنگل کو تیری بدبو سے آلودہ نہ ہونے دونگا۔ اسوقت وہ خول بولا اب میں ہوشیاری کی ایک کہانی کہنی چاہتا ہوں۔ اسکو سن لے۔ پھر جو تیرا جی چاہے کر۔

میں نے پھول پنکھڑیوں کو اپنے اوپر لپیٹ کر آنکھیں خول کی طرف پھیر لیں۔ اور اس سے کہا۔ پہلے یہ بتا کہ اس دنیا نے تیری کیا قدر کی جو تو دنیا میں رہنے پر اتنا اصرار کرتا ہے اور اسکی امیدوں کی سیری پر فدا ہوا جاتا ہے۔ ناحق تسالیں دیکر مجکو گرفتار کرنے کی کوشش کرتا ہے میں جب تک تجھ میں تھا۔ ایک اچھا لکھنے والا اور اردو زبان میں ایک نئی روش ایجاد کرنے والا سمجھا جاتا تھا جو قلم سے ظاہر ہوتی تھی۔ یا کبھی کوئی سامنے آکر اس کو ادا کرتا تھا کو جانتا ہے کہ اس وقت مجھ پہ کیا حالت گزرتی تھی۔ میں الفاظ پرست خولوں کی یہ تعریف سن کر بگڑ جاتا تھا کہ ایسے کیوں ہیں۔ جو میری اس شان کو بیان نہیں کرتے جس پر مجھ کو نور حق نے اقتدار دیا ہے۔ نور حق سے میں جو کہتا ہوں وہ سن لیتا ہوں۔ اور اس کو پورا کر دیتا ہے میں جس کی سفارش کی نور حق نے اس کو کبھی نہ ٹالا یہی نہیں نور حق نے اپنے اطلسی رنگا رنگ جلووں کو میرے پاس تنہا چھوڑ دیا۔ اور میں نے ان میں خوابگاہ بنائی۔

آدمیوں کے جلانے میں بھی نہ لگا۔ یہ آدمی رشک کرنے لگتے ہیں جب کسی کے پاس کچھ دیکھتے ہیں۔ اور اگر انسان کو اپنے خول سے محبت ہو تو دوسروں کا رشک و حسد سہ کر

تکلیف دیتا ہے۔ کیا تو نے پایا کہ دنیا میں کتنے تیرے حاسد ہیں اور انکی مکارانہ کینہ وری سے تجکو کیسے کیسے صدمے اٹھانے پڑے۔ اگر تو اپنی خواہشات خاکی کو فراموش کر دے اور میرے مراقبے و توجہ کے آگے سر جھکا دے تو تیری یہ ساری تکلیفیں دور ہو جائینگی اور تو دنیا کے سب خولوں کا سرتاج بن جائے گا۔ مگر تجھ میں سرتاج بننے کی خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ سرتاجی دکھ و سکھ کے جذبات کی فنائیت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ جب یہ جذبات بھی نہ ہونگے تو تجکو اسکی خوشی نہیں ہو سکتی البتہ تجھ کو تو رحق سے وہ انعام ملیں گے جن سامنے دنیا کی سب خوشیاں ہیچ ہیں۔ میرے خول نے یہ سنکر کہا۔ اچھا تو میری کہانی سن۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا۔

جڑی بوٹی کا شہید

چادر گل کے فرزل سن۔ کھڑا ہو۔ قدرت کی حقیر اولاد۔ جو ایک دن دنیا میں پیدا ہوتی۔ بڑھتی پھولتی پھلتی اور مرجھا کر فنا ہو جاتی ہے۔ جس کا نام گھاس ہے۔ بناس پتی ہے جنگل کی جڑی بوٹی ہے اور جو تیری گلکار مسہریوں کے دامنوں میں کوسوں خاک سے سر نکالے چپ چاپ کھڑی ہے۔ بڑی قاتل ہے۔ سفاک ہے۔ بڑی دولت والی ہے۔ امیری کی کنجی ہے۔ بڑی طبیب ہے امراض کی موت ہے۔ بڑی زندگی ہے۔ حیات کی روح رواں ہو۔

ایک پہاڑ کے نیچے میدانی زمین میں ایک راجہ رہتا تھا جس کا ایک ہی بیٹا تھا اس کا نام اندر جوت تھا اسکی عمر سولہ برس کی تھی کہ باپ مر گیا اور گدی اس کے ہاتھ آئی۔ اندر جوت کی رانی کنولا چودہ برس کی اور اندر جوت سے صورت شکل میں ذرا گھٹیا تھی۔ اندر جوت اپنے زمانہ کا کنہیا تھا۔ اس کے حسن کی دھاک دور دور تھی۔ اسکو اپنی خوبصورتی پر گھمنڈ بھی تھا۔ سب سے بڑی سندرتا (خوبصورتی) اسکی آنکھوں میں تھی۔ اندر جوت اس کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ مگر جس کو دیکھتا تھا جس چیز پر نظر ڈالتا تھا اس میں اپنی آنکھوں کی طاقت کو دکھاتا ہے۔ وہ آزمایا کرتا تھا۔ کیونکہ آدمی ہو جانور۔ پتھر ہو یا درخت۔ اسکی آنکھوں کے سحر سے ٹھہر جاتے تھے

یا اندر جوت کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے والی چیز اسکی آنکھوں کے رعب حسن سے جھک گئی
ہے اور بے قابو ہے۔

کنولا اپنے پتی (شوہر) سے بہت کم تھی مگر اس کے دل میں بھی خدا نے ایسی کشش دی تھی کہ
اندر جوت کا والہ و شیدا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے اندر جوت کنولا کو لے کر دیبی کے درشن کو گیا جو پہاڑ کے دامن میں براجمان
تھی راستہ میں اسکو ایک پودا جنگلی جھاڑی پر نظر آیا جس کے سرمئی پیارے رنگ کے سامنے اسکی
بدصورت پودی بہت بری معلوم ہوتی تھی۔ اندر جوت نے کنولا سے کہا۔ کہ پودا اس بدشکل جوڑ
سے کیونکر خوش رہ سکتا ہوگا۔ کنولا بولی جس طرح تم میرے ساتھ۔ یہ سنکر اندر جوت ایک خیال میں
پڑ گیا اور اس کو حسن کے غرور نے تھوڑی دیر بے خود بنائے رکھا۔

اندر جوت دیبی کے درشن کرکے واپس آ رہا تھا کہ ایک مور دکھائی دیا جو اپنے بے مثال
حسن کا لباس پہنے اپنی کالی کلوٹی بے قرینہ مورنی کو اپنا ناچ دکھا رہا تھا۔ اندر جوت کو پھر
پودے کا خیال آیا تو اس نے کنولا سے کہا۔ یہ بڑا بے وقوف ہے۔ ایسی بدشکل بیوی پر عاشق
ہو رہا ہے۔ پودا اور مور اور شاید مورنی تینوں عقل سے دور ہیں۔ کنولا میں تجھ سے چار مہینے بات نہ کروں
جب تک اس کا بھید مجھکو معلوم ہو جائے۔

کنولا بڑی عقل مند لڑکی تھی۔ اس نے اندر جوت کے اس بچن سے برا نہ مانا اور کہا کچھ
نہیں تم اس کو سوچو تحقیق کرو اور چار مہینے مجھ سے الگ رہ سکتے ہو تو رہو میں تم کو اجازت دیتی ہوں

اندر جوت یہ سنکر بگڑا اور کہا تم کو اجازت دینے یا نہ دینے کا کچھ اختیار نہیں ہے۔ میں نے
اپنی خود مختاری سے یہ ارادہ کیا ہے اور اپنے ہی اختیار سے اس پر عمل کروں گا۔ تم میری تابعدار
لونڈی ہو مگر بہت بدصورت ہو۔ تم میرا جوڑا نہیں ہو سکتیں۔ تم میری آنکھوں کی جوت تک کو
سہار نہیں سکتیں اور میرے نگاہ بھر کر دیکھتے ہی نظریں جھکا لیتی ہو۔

کنولا بولی۔ جو کچھ تم نے کہا سچ ہے۔ میں تکرار نہیں کرتی۔ تم چار دن سے زیادہ اپنے

ارادے کی خود مختاری پر قائم رہ جاؤ۔ تو غنیمت ہے مجکو خدا نے حسن نہیں دیا تو دوسری نعمت دی ہے جو تم کو میسر نہیں۔

اندرجوت۔ وہ کیا نعمت ہے؟

کنولا۔ تمہیں سوال کرنے کا کچھ اختیار نہیں!

اندرجوت۔ میں پوچھتا بھی نہیں۔

اتنے میں گھر آگیا اور یہ دونوں علیحدہ علیحدہ اتر کر حویلیوں میں چلے گئے۔

کنولا نے حویلی میں جاتے ہی ماما کو اپنے گرو کے پاس بھیجا جس نے سارا قصہ اُن سے کہا۔ گرو جی اگرچہ عنایت بڑا عالم اور دنیا کے حال سے خبردار تھے! انہوں نے ماما کو دھکا کر نکال دیا اور کہا میں کیا کروں میاں بیوی کے قضیے میں دخل دینے کا مجھے کچھ حق نہیں ہے۔ جا کنولا سے کہدے کہ آئندہ مجھ سے اپنے گھر کے جھگڑے بیان نہ کرنا۔

ماما سہمی ہوئی کنولا کے پاس آئی۔ اور گرو جی جنگل گئے اور وہاں انہوں نے صحت کے منتروں پر کچھ دم کیا اور نالے میں ڈال دیئے۔

اِدھر کنولا کو گرو جی کے برتاؤ سے اتنا رنج ہوا کہ اس نے ہیرے کی کنی کھانے کو منگائی مگر فوراً اس کے دل نے کہا کہ جو تعلیم گرو جی نے مجھ کو دی ہے اس میں صبر کا بڑا درجہ ہے سنتوش پرم لابھ (صبر میں بڑا نفع ہے) رامچندر جی کا قول ہے۔ پس مجھ کو بھی اپنے کلیجے پر پتھر رکھنا چاہیئے دیکھئے غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

کنولا اسی خیال میں تھی کہ اندرجوت آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے پاس آیا اور اس کے پیروں میں گر پڑا۔ کنولا نے کہا خیر ہے۔ تم میرے پتی اور مالک ہو اور میں تمہاری ادنیٰ لونڈی یہ کیا کرتے ہو۔

اندرجوت بولا میں نے غلطی کی جو تم سے ایسی سخت باتیں کیں خدا نے میرے دل کو روشنی دی اور میں نے تمہاری شان پہچان لی۔ اب میں کبھی اسکی قدرت میں دخل نہ دونگا۔

کنولا حیران تھی کہ یہ کیا انقلاب ہوا۔ اتنے میں دیکھا کہ گرو جی ہاتھ میں ایک بوٹی لئے چلے آتے ہیں انہوں نے وہ بوٹی اندرجوت کو دی اور کہا لے ذرا اسکو اپنی آنکھ پر رکھ۔

اندرجوت نے اس پتے کو اپنی آنکھ سے لگایا تو کیا دیکھتا ہے کہ کنولا ایک نور کا پتلا ہے اور اس قدر حسین ہے کہ اندرجوت نے اس سے پہلے کبھی ایسی خوبصورت عورت نہ دیکھی تھی۔ اس کے بعد گروجی نے کہا نادان انظر کے دہوکہ میں ہے۔ اس دنیا میں جو بدصورت ہیں انکو قدرت کی آنکھ سے دیکھے گا تو اچھی شکل میں پائے گا۔ مورنی اور پودنی خاکی آنکھوں میں بدنما ہیں مگر مور اور پودنے کی حقیقت شناس نگاہوں میں بے حد خوشنما۔

اندرجوت کو حیرت تھی کہ گروجی کو ہمارے مخفی قصے کی کیونکر خبر ہو گئی اور ان کی کرامت کا قایل ہو گیا۔

اب اندرجوت گروجی کے پاس روزانہ جانے لگا اسکو جڑی بوٹی کے علم کا شوق ہو گیا تھا گروجی نے بھی اس کے شوق کے موافق بوٹیوں کے صدہا خواص سکھائے۔

کایا پلٹ بوٹی

ایک دن گروجی نے اندرجوت کو کایا پلٹ بوٹی بتائی اور کہا اسکو اگر ناف پر باندھ لیا جائے تو انسان اپنی روح کو جسم سے نکال کر آزاد کر سکتا ہے اور روح کو جہاں چاہے سیر کرنے کو بھیج سکتا ہے اور جب جی چاہے اور واپس بلا سکتا ہے۔

اندرجوت نے کہا پھر دوبارہ اپنے جسم میں بھی ڈالنا ممکن ہے یا نہیں۔ گروجی بولے کیوں نہیں یہ نہ ہو تو کمال ہی کیا ہوا مگر شرط یہ ہے کہ روح کو کسی ایسی جگہ نہ بھیجے جہاں سے وہ الٹی نہ آسکے۔

اندرجوت۔ وہ کونسا مقام ہے جہاں سے روح واپس نہیں آتی۔

گروجی۔ خدا کی جھولی جسمیں ارواح رہتی ہیں۔ روح کا پسندیدہ مقام ہے

اندرجوت۔ وہاں مجھے بھیجنے کی کیا ضرورت ہو گی۔ میں کبھی وہاں نہ بھیجوں گا۔

گروجی۔ نہیں یہ بات تمہارے اختیار میں نہیں ہے دیکھو جو لوگ کسی نیک کام کی

حمایت میں مارے جاتے ہیں اُن کی روحیں خدا کی ذات سے قریب ایک نورانی قندیل میں چلی جاتی ہیں اور جہاں اُن کو ایسا مزا ملتا ہے جو دنیا کے کسی سرور کے مشابہ نہیں ہے جس کو تم سمجھ سکو میں یہ خیال کرتا ہوں بہت ہی بڑا لطف ہے۔ جو خدا کی ذات میں فنا ہونے سے پہلے اس مادی دنیا میں ارواح کو میسر آتا ہے۔

اگر تم نے کایا پلٹ بوٹی سے اپنی روح کو اپنے خول سے الگ کر لیا اور کہیں سیر کرنے کو بھیجا تو ضرور وہ آزادی کی ہوا سے سرشار ہو کر اپنی شہید روحوں کی قندیل میں جائے گی۔ اور وہاں گئی تو پھر کبھی نہ آئے گی۔

اندرجوت۔ جب اس قندیل میں آپ کے فرمانے کے موجب بہت بڑا سرور حاصل ہوتا ہے تو میں اپنی روح کو واپس کیوں بلاؤں گا۔ اچھا ہے کہ وہ ہمیشہ وہاں رہے جہاں اس کو راحت اور چین ملتا ہو۔ اس دنیا کی تکلیف اور بے مزہ زندگی سے تو وہ لاکھ درجہ بہتر ہے۔

گرو جی۔ یہ سچ ہے مگر قندیل مبارک میں غیر شہید روح کو رہنے کا حکم نہیں ہے جو روح جسم کی شہادت کے بغیر محض سیر کے لئے وہاں چلی جاتی ہے تو چند روز کے رہنے کے بعد اسکو ایک دکھ لگ جاتا ہے اور وہ پھر دنیا کے کسی ناپاک جسم میں ڈال دی جاتی ہے اور قید کی تکلیف اٹھاتی ہے۔

اندرجوت۔ تو پھر میں کسی نیک کام میں شہید ہو کر اپنی روح کو قندیل مبارک میں کیوں نہ پہنچاؤں

گرو جی۔ ہاں ایسا کرو گے تو ہمیشہ وہاں رہو گے۔

اندرجوت۔ تو بتایئے کہ وہ شہادت کونسی ہے۔

گرو جی۔ خدا اور اس کے علم کی تلاش میں اگر آدمی مر جائے تو اسکی روح قندیل مبارک میں چلی جاتی ہے کسی مظلوم کی حمایت میں مارا جائے تو اسکو یہ درجہ ملتا ہے۔

لیکن اے اندرجوت اگر تو جسم کی قید میں رہ کر اپنی خواہشوں پر قابو رکھے اور خدا کی دی ہوئی طاقتوں کو نیک کام میں صرف کرے اور نفس کی دشمنی پر فتح پائے تو کسی نہ کسی روز قندیل مبارک میں ضرور تیری روح کو جگہ دی جائے گی اور تیرا نام شہیدوں میں لکھا جائیگا

دیکھ حسن زمانہ میں اچھی باتوں کی بے قدری ہو جائے اور خلقت نیکیوں کو عقل و آرام کے خلاف سمجھنے لگے۔ اس وقت میں اگر کوئی شخص ایک نیکی کو بھی زندہ کرے گا تو اسکی روح کو مرنے کے بعد قندیل حق میں اونچی جگہ دیجائے گی۔

اندر جوت نے گروجی سے یہ سنکر اپنے وقت کے دو حصے کئے ایک میں وہ اپنی حکومت کے کام کرتا تھا اور مظلوموں کی فریاد سنتا تھا۔ اور دوسرے میں جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کرتا تھا۔ اور کنولا بھی اس کے شریک حال رہتی تھی۔ ایک روز وہ کنولا سمیت ایک بوٹی کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ کہ اس کے پاؤں میں ایک سانپ نے کاٹا۔ کنولا سانپ کو پاؤں سے چھڑانے لگی۔ کیونکہ وہ انگوٹھے کو چمٹ گیا تھا۔ تو سانپ نے کنولا کے ہاتھ میں بھی کاٹ کھایا۔ سانپ ایسا زہریلا تھا۔ کہ دونوں وہیں پانی ہو کر بہہ گئے۔ مگر ان کی ارواح فوراً قندیل مبارک میں اُڑ کر چلی گئیں۔ جہاں ان کا ارواح نے بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ اور یہ دونوں ابدی اور کامل عیش سے وہاں رہنے لگے۔

لہذا تو بھی اے میری روح ایسا ہی کر اور مجھ خول میں مقدور کر نیک کاموں میں مصروف ہوتا ہے شہیدوں کی قندیل حق تک رسائی پائے۔ یوں خواہ مجکو ترک کرنے اور غیر فطری آزادی سے تجکو کچھ حاصل نہ ہوگا۔

میں نے اپنے خول کی کہانی سنکر قہقہہ لگایا اور کہا دیولنے تو نے اپنے خاکی جذبات کے مطابق قندیل حق کو بھی عیش خانہ سمجھا۔ کوئی اور مثال دی ہوتی۔ مگر دنیا کیونکہ تیری عقل کا عروج تو خواہشات و لذات نفس تک ہے۔

خول۔ نہیں میں نے کہا ہے کہ قندیل مبارک میں جو سرور ارواح کو ہوتا ہے اس کی مشابہت ہماری دنیا کی کسی چیز سے نہیں ہے۔ صرف سمجھنے کو کسی دنیاوی لطف سے نسبت دے سکتے ہیں۔

میں۔ خیر اگر تو نے یہ بھی کہا تب بھی خیال کرتا ہوں کہ تیری پرواز فانی لذتوں سے آگے نہیں ہے۔ میں قندیل حق میں شہید ہو کر جانا پسند کرتا ہوں۔ مگر اس لئے نہیں کہ وہاں

مجکو دوسری ارواح کے ساتھ عیش و راحت نصیب ہو۔ وہاں میرا کام یہ ہوگا کہ سب ارواح کو قندیل کی قید کا دکھ بتاؤں۔ اور ان سے کہوں کہ تم سب جد و جہد کرو اور اس محدود حیات سے نکل کر ذات الٰہی کی نامحدود ہستی میں فنا ہو جاؤ۔ کیونکہ قید تعین میں خواہ ہم کو کیسا ہی لطف ہو پر وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو محویت و فنائیت ذات میں ہو سکتی ہے۔

اگر میں قندیل حق کے بعد بہشت میں گیا تو وہاں بھی جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا کہ کس قسم کا عیش چاہتا ہے تو آزادی بیان حق کی طلب کروں گا۔ اور جنت والوں کو بہکاونگا کہ وہ بہشت کے جیل خانے سے نکلیں اور موج الوہیت کی غرقابی خدا سے مانگیں۔

اے خول میں تجھ سے نفرت نہیں رکھتا میں تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو قانون اسلام اور قانون دنیا کے برخلاف ہو میں تجھ کو کسی قسم کی مادی اذیت نہیں دینا چاہتا۔ مجکو یہ بھی منظور نہیں کہ فطرت کے مقررہ وقت سے پہلے تجھ سے الگ ہو جاؤں یا کسی اور کو ایسا کرنے کی نصیحت کروں میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ تجھ سے جدا ہو کر ذرا اپنے اور تیرے حالات کا مطالعہ کیا کروں۔ جب تک تجھ سے جدا نہ ہونگا۔ سمجھ نہیں سکتا تو کیا ہے اور میں کیا ہوں۔ تو کس حال میں ہے اور میں کس حال میں ہوں تجھے کیا کرنا چاہئے اور مجھ پر کیا کیا فرائض ہیں۔

میری مٹی کے پتلے تیری دید کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ تیرے اندر بند رہ کر تو ہی بتا کہ تجھ کو کیا دیکھ سکتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ دید کے ہزاروں طریقے ہیں مگر جو دید منزل تک پہنچاتی ہے وہ تیرے بندھن سے باہر آئے بغیر ہاتھ نہیں آسکتی۔

یہ خیال نہ کر کہ میں ہمیشہ اس پھول کی ہستی پر بستر جمائے جمائے رہوں گا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ محدود رہنا مجھ کو بالکل ناپسند ہے میں ہمیشہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے میں مصروف رہتا ہوں اور اس میں کہیں نہ رکونگا تا وقتیکہ خدا کو نہ پالوں اور خدا کے پانے پر بھی چپکا نہ ہونگا یہاں تک کہ اسکی ذات میں سما کر نابود کے اسم سے آزادی حاصل نہ کر لوں۔

اے غافل میں تجھ سے جدا کیسے ہوں تو مجھ میں ہے۔ میں تجھ میں ہوں اور تیرے ہی اندر رہ کر
علم حاصل کر رہا ہوں۔ مگر یہ وہ اندرون نہیں جس کو تو چاہتا ہے کہ خواہشوں میں اسیر ہو کر
علم حاصل کرے۔ بلکہ یہ وہ اندرون ہے جو تجھ روح کی اصطلاح میں اندرون ہے اور
جس سے حکم خدا کی تعمیل اور دنیا میں آنے کا منشا پورا ہوتا ہے۔

ہتکڑی کی کہانی

میری جونی سلام، افوہ کتنی مشکل سے سانس آیا ہے۔ سوچتے سوچتے آج تین دن
ہو گئے تم کو خط بھیجنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ میں شہری تم دیہاتی دونوں کی وضع
قطع الگ۔ رسم و رواج الگ، حال الگ، خیال الگ، تمہارے ہاں جو باتیں عیب ہیں
ہمارے ہاں انہی کی تعریف کی جاتی ہے۔ میں حیران تھا۔ کیونکر تم کو اپنے عندیہ سے آگاہ
کروں اور خود تمہارے خیالات سے خبردار ہوں اس پیام سلام سے تو میرا ناک میں دم
آ گیا۔ ابا جان پرانے خیال کے آدمی ہیں جو سات پشت سے تمہارے گاؤں کی زمینداری
کر رہے ہیں۔ مجھے تو اس کشمکش کے خیال کرنے سے الجھن ہوتی ہے۔

بارے آج خدا خدا کر کے تمہارے استاد مولوی صاحب سے ملنا ہوا۔ بہت بھولے بھالے
اور نیک آدمی ہیں انہوں نے ماموں جان سے بیان کیا کہ اب تو نئی روشنی دیہات میں
بھی پھیلتی جاتی ہے۔ چودھری خواص خاں کو دیکھو بچارے سیدھے سادھے زمیندار
ہیں جنہیں دنیا جہان کی کچھ خبر نہیں۔ دھوتی باندھے ہوئے کاشتکاروں میں گشت
لگاتے پھرتے ہیں مگر ان کی صاحبزادی کا رنگ ہی اور ہے۔ آٹھویں۔ دسویں کا پورا
مس صاحبہ پڑھانے جاتی ہیں۔ اس منحوس نے خبر نہیں کیا جادو کیا ہے کہ لڑکی رات دن
انگریزی فیشن کی آرائش میں لگی رہتی ہے۔ میں مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ پڑھاتا تھا تو

دیکھتا تھا کہ ماشاء اللہ بہت ہی ذہین اور ہونہار لڑکی ہے۔ حدیثوں کے مطالب کو بہت اچھی طرح سمجھ لیتی ہے۔ مگر جب سے مس صاحبہ کے قدم آئے ہیں لڑکی کے مزاج ہی کچھ اور ہو گئے۔ اچھا خاصا جہاں آرا بیگم نام ہے۔ مگر جب سے اس فرنگن نے مس جوئی کہہ کر پکارا ہے سارا گھر مس جوئی کہتا ہے اور غضب تو یہ ہے کہ لڑکی بھی اس نام سے خوش ہوتی ہے۔ میں دونوں وقت پڑھانے جاتا ہوں مگر اس کو اخباروں اور ناولوں ہی سے فرصت نہیں۔ میں بڑے خان صاحب سے ملا تو صاف کہہ دیا کہ آپ ایسی نیم عیسائی لڑکی کو بیاہ کر لائیں گے تو سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گے۔

ڈیر جوئی! بس یہی گفتگو تھی جس کو سنکر مجھے یہ خط لکھنے کی جرأت ہوئی یہ خط لانے والی میری معتبر ماما ہے تم اس کے ہاتھ جواب بھیج سکتی ہو۔ اب مجھے کچھ عرض حال کی اجازت دو میں بہت خوش ہوا جب میں نے مولوی صاحب سے تمہاری یہ حالت سنی۔ پہلے میں ڈرتا تھا کہ ابا جان کہیں گاؤں میں میری تقدیر ایسی جگہ نہ پھوڑیں جس سے میری ساری زندگی برباد ہو جائے۔ مگر مجھ کو اپنی قسمت پر ناز ہے کہ قدرت نے ہم خیال شریک زندگی دینے کا سامان مہیا کیا۔ میں نہایت پاک بازانہ لہجے میں یہ خط لکھ رہا ہوں اور تم کو یقین کرنا چاہئے کہ اس سے پہلے مجھے اس قسم کے اور خط لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ میں ایل بی اے کا امتحان دینے والا ہوں اور اس تعلیم کی محنت میں سوائے تمہارے خیال کے اور کوئی چیز تفریح کی مجھ کو نصیب نہیں ہے میری خوشی آسمان تک پہنچ جائے گی اگر دو حرف جواب کے لکھو گی اور آئندہ خط و کتابت کے سلسلے کو منظور کرو گی

جواب

دیکھو صاحب میرے اس پہلے خط کو آخری جانو تم نے جو کچھ سنا اس میں بہت مبالغہ ہے نہ میں اتنی آزاد ہوں نہ ایسی بے لحاظ آزادی کو پسند کرتی ہوں والسلام

راقمہ ایک کنواری

رضامندی

قدرت خاں صاحب نے خواص خاں صاحب کو بیٹی دینے کے لئے راضی کرایا اور منگنی کے لین دین کی رسمیں بھی ادا ہو گئیں ایک روز نصرت خاں قدرت خاں کا بیٹا اپنے کمرہ میں بیٹھا جوہی کے روکھے پھیکے خط کا خیال کر رہا تھا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ عجیب مزاجدار لڑکی ہے دیکھئے کیونکر نباہ ہوتا ہے کہ اتنے میں نوکر نے ایک خط دیا اس نے کھول کر دیکھا تو یہ عبارت درج تھی

خاں صاحب رسم و رواج کی تکمیل نے مجھکو اجازت دی ہے کہ میں اپنی سابقہ ترش نویسی کو واپس لوں اس کے بعد زیادہ رکھنے کی آپ کو بھی ضرورت نہیں ہے دنیا کی مراسم کے ساتھ ہمارے مراسم میں ترقی ہونی مناسب ہے۔

راقمہ اپنے گھروالوں کی جوہی۔

نصرت خاں اس خط کو دیکھتے ہی بھڑک گیا اس کے جذبات میں طوفان برپا ہو گیا وہ اٹھا کہ لیمپ کو تیز کر کے فوراً جواب لکھنے بیٹھ جائے گھبراہٹ میں لیمپ کو ایسی ٹکر لگی کہ وہ گر کر چکنا چور ہو گیا اور کمرہ میں آگ لگ گئی نصرت آگ بجھانے سے پہلے خط بچانے کو دوڑا مگر آگ اس تیزی سے بھڑکی کہ یہ اپنے دامن بھی نہ بچا سکا اور اسکے کپڑوں میں بھی آگ لگ گئی اسی حالت میں یہ باہر نکلا اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔ نوکروں نے بمشکل پہلے اس کے کپڑوں کی آگ بجھائی اسکے بعد کمرے کو ٹھنڈا کیا مگر اس اثنا میں کمرہ کا کل سامان خاکستر ہو چکا تھا۔ نصرت کے زخم خفیف تھے لیکن گردن اور سینہ پر دو ایک زخم گہرے تھے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ حکیم ڈاکٹر جراح آنے لگے تیسرے دن گاؤں میں ان کے سسرال والوں کو خبر ہوئی اور خواص خاں بھی داماد کی مزاج پرسی کو آئے وہ بیٹھے ہوئے تھے کہ جوہی کا خط ڈاکیہ نے لا کر نوکر کو دے دیا۔ نصرت نے لفافے کو دیکھ کر خط پہچان لیا اور سسرے کے لحاظ سے اسکو الٹا کر کے رکھ لیا۔ جب وہ چلے گئے تو کھول کر دیکھا یہ لکھا تھا۔

زخمی خاں کو سلام۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے آپ نے اپنے گھر کے لیمپ کو اتنا شوخ کیوں کر رکھا ہے جو اتنی بڑی بڑی گستاخیاں کر سکتے ہیں معلوم نہیں

مجھے آپ کے زخموں کی تشریح پوچھنے کا حق ابھی حاصل ہوا ہے یا نہیں۔ تاہم اپنا فرض سمجھتی ہوں کہ زخمیوں کی بیمار پرسی کروں۔ میرا دل اس قسم کے بیماروں کے لئے ہمیشہ کڑھتا ہے خدا کرے وہ سب اور آپ جلد تندرست ہو جائیں۔" راقمہ زینب حسن صاحبہ کی جونئی۔

نصرت نے اسی حالت میں قلم دوات منگوائی اور لیٹے لیٹے یہ خط لکھا۔

میں آپ کا خطاب نہیں جانتا۔ میں آپ سے ابھی زیادہ واقف نہیں ہوں پھر یہ نمک ورہم کیوں بھیجا ہے۔ جو کچھ کیا اس خط نے کیا جو چار دن پہلے آیا تھا۔ لیمپ کی شرارت میں شک نہیں اس نے جواب نہ لکھنے دیا اور گردن میں آگ لگادی۔ اچھا ہوں زخم صرف دو ہیں سینہ کے اوپر بائیں جانب دل کے پاس۔ گردن میں شہ رگ کے قریب۔ ڈاکٹروں کو اسی کی تشویش ہے۔ مگر تم فکر نہ کرنا۔ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی میں نہیں تو مجھ جیسے اور بیمار ضرور اچھے ہو جائیں گے۔ جن کو میرے ساتھ شریک کیا گیا ہے۔

راقم بہت سے بیماروں میں کا ایک زخمی

شادی کی دھوم

جہاں آرا خواص خاں کی اکلوتی لڑکی تھی اور بڑے بڑے لاڈوں سے پلی تھی اسکی شادی کی خوشی میں جتنی خوشی کیجاتی کم تھی۔ جہاں آرا کی فضول خرچیوں سے خواص خاں کا پہلے ہی ناک میں دم تھا اور اب تو ایک بڑی دھوم دھام کا وقت آیا تھا۔ چاند ادسکے ڈیڑھ ہزار روپے قرض لینے کا سامان شروع ہوا۔ جب یہ خبر جہاں آرا کے استاد مولوی صاحب کو ہوئی تو انہوں نے خواص خاں کو تخلیہ میں بلا کر سمجھایا اور کہا میاں جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ قرآن شریف میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔ یعنی اسراف نہ کرو کیونکہ اسراف کرنیوالے شیطان کے بھائی ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا کلوا واشربوا ولا تسرفوا ان اللہ یحب المسرفین کھاؤ اور پیو مگر فضول خرچی نہ کرو۔ خدا فضول خرچ لوگوں کو پسند

نہیں کرتا۔ میں نے سنا ہے آپ جائداد رہن کر کے سود پر قرض لینے والے ہیں۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے قیامت کے دن آپ حضرت رسول خدا کو کیا منہ دکھائیں گے کہ ان کی سنت کی تقریب اور سودی لین دین سے ہو۔ آپ کو معلوم بھی ہے سود کا لینا اور دینا کتنا گناہ ہے۔

خواص خاں نے کہا تو پھر آپ ہی بتائیے کیا کروں۔ ساری زندگی میں ایک شادی لیکر بیٹھا ہوں اس میں بھی دل کے ارمان نہ نکلے تو لوگ کیا کہیں گے نام بہت بڑا ہے گاؤں در گاؤں جوئی کی شادی کے چرچے ہیں۔ اگر میں نے خرچ کرنے میں کچھ کمی کی تو ناک کٹ جائیگی بیشک آپ نے جو فرمایا آمنا وصدقنا مگر جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب جوئی کے لئے ہے مجھے تو دو جو کی روٹیاں اور کٹورا بھر چھاچھ زندگی بسر کرنے کو کافی ہیں۔

مولوی صاحب نے فرمایا خبر بھی ہے کہ اس نام و نمود کی خاطر کتنے لوگ بے نام و نشان ہو گئے میرے دیکھتے دیکھتے سینکڑوں جاگیرداروں کی زمینیں سود خوار بنیوں کے پاس چلی گئیں اور ہر جگہ یہی شادی غمی کی رسمیں نام و نمود اور ناک کا خیال ان لوگوں کو برباد کرتا تھا اگر تم خرچ کم کرو گے تو دو چار دن طعن تشنیع کی باتوں کے چرچے رہیں گے اس کے بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہیگا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور تم اسی عزت و آبرو سے زندگی بسر کرتے رہو گے اور جائداد ہاتھ سے گئی تو چار دن کی واہ واہ تو ہو جائے گی لیکن یہی واہ واہ کرنے والے ہمیشہ تم کو ذلت و حقارت کی نظروں سے دیکھا کریں گے۔

خان صاحب اس زمانہ میں بڑی عزت پیسے کی ہے آدمی کسی کو کچھ نہ دے مگر روپیے والا ہو تو سب لوگ یہاں تک کہ حکام وقت بھی اس کی آؤ بھگت کرتے ہیں خواہ ذات میں وہ چمار ہو یا حلال خور اور مفلس بادشاہ زادہ ہو یا پیرزادہ شیخ ہو یا مغل سید ہو یا پٹھان کوئی بات نہیں پوچھتا تو پھر ایسی بات کیجئے کہ دین میں بھی بھلا اور دنیا میں بھی بھلا۔

خواص خاں کے دل پر اس تقریر کا بڑا اثر ہوا اور انہوں نے قرض لینے کا ارادہ ملتوی

کر دیا مگر قدرت خاں بہت شان و شوکت سے برات لیکر آئے اور جب خواص خاں کے
ہاں اپنی شان کے مطابق مدارت نہ دیکھی تو بہت بگڑے جھلائے اور کہنے لگے میری
آبرو دو کوڑی کی کر دی ایسی بھی کیا بخیلی ہے میں شہر کے جن رئیسوں کو لایا ہوں کیا ان
کی شان گائے کے گوشت اور اس موٹے چاولوں کے دھوبیا پلاؤ کھانے کی ہے خواص خاں
کو خبر ہوئی تو وہ ہاتھ جوڑ کر سامنے آئے اور بھرے مجمع میں کہا کہ بھائی صاحب اللہ کے فضل
سے میں بھوکا ننگا نہیں ہوں جتنے آدمی آپ اپنے ہمراہ لائے ہیں چالیس دن انکی مکلف
دعوتیں کر سکتا ہوں مگر مجکو تو ان مولوی صاحب نے خدا کے غضب سے ڈرایا۔ جو آپ کے
سامنے بیٹھے ہیں اور زیادہ خرچ کرنے سے روکا میں نے خدا اور رسول کا حکم مانا ہے یہ حضرات
ہمیشہ اپنے گروہ میں نفیس سے نفیس کھانے کھاتے ہیں آج اگر اپنے ایک دوست کی خاطر
ذرا سی تکلیف اٹھالیں گے تو کیا مضائقہ ہے میں اپنی تمام جائداد جوئی کے نام لکھتا ہوں
اور لیجئے یہ ہبہ نامہ موجود ہے جب تک زندہ ہوں خود انتظام کرونگا اور اسکے عوض روکھی
سوکھی روٹیاں کھاؤنگا اور موٹا جھوٹا کپڑا پہنونگا اور پیسہ پیسہ آمدنی کا سب آپکے
گھر میں پہنچاؤنگا۔ جب میری آنکھیں بند ہو جائیں تو میاں نصرت جز و کل کے مالک مختار ہیں۔
خواص خاں نے یہ باتیں اس انداز سے کیں کہ قدرت خاں اور تمام حاضرین متاثر
ہوگئے اور چاروں طرف سے آفرین و مرحبا کے نعرے بلند ہونے لگے۔

دولہا کی حیرت

جب دلہن گھر میں آئیں اور نصرت خلیے کے کمرہ میں گیا تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ
جس جوئی کو اس نے آرسی مصحف میں دیکھا تھا یہ وہ نہیں ہے بلکہ کوئی اور کالی صورت
کی بد قطع لڑکی ہے نصرت نے ہر چند اس نیک بخت سے پوچھا کہ تو کون ہے مگر وہ منہ
سے نہ بولی۔ نصرت آشفتہ ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اور وہاں جا کر سو گیا۔ صبح ہوئی
تو عورتیں دلہن کے کمرے میں گئیں تو وہاں دیکھا کہ دلہن غائب ہے۔ پہلے خیال ہوا کہ

پاخانہ میں ہونگی مگر جب وہاں بھی نہ پایا تو پریشانی کے چرچے ہونے لگے۔ نصرت ابھی سو رہا تھا۔ اسکو جگا کر یہ ماجرا کہا گیا۔ اب تو نصرت کے حیرانی اور بھی بڑھی اور اس نے دوستوں سے رات کا سارا قصہ بیان کیا۔ اسی وقت گاؤں کو ایک آدمی دوڑایا گیا اور شادی کے گھر میں ماتم برپا ہوگیا دوپہر کو نصرت کے نام ایک تار جبل پور سے آیا جس میں یہ تحریر تھا "پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔" "راقم نور جہاں"

شام کو گاؤں سے خبر آئی کہ یہاں بھی دلہن کا پتہ نہیں ہے نہ دلہن کی محرم راز چھوکری کریمن ملتی ہے وہ بھی کل سے غائب ہے ہر گھر میں شور و بکا تھا۔ آخر پولیس میں خبر دی گئی اور تفتیش ہونے لگی نصرت بار بار خیال کرتا تھا کہ یہ تار ہو بہو جہاں آرا کا ہے لیکن وہ پوچھتا تھا کہ عورت ذات شادی کے بھرے گھر سے کیونکر اور کس کے ساتھ جبل پور پہنچ گئی۔ آخر اسکو خیال آیا کہ مشن کی مس سے اسکا حال معلوم ہوگا چنانچہ وہ گرجا گیا اور پادری صاحب سے مس روزی کا حال دریافت کیا۔ پادری صاحب نے کہا دو ہفتہ ہوئے وہ رخصت لیکر اپنے ماں باپ کے پاس بمبئی گئی ہے بمبئی کا پتہ معلوم کرکے نصرت اپنے گھر آیا اور یہاں اس نے بمبئی جانے کی تیاری شروع کی اتنے میں اسکو ایک خط ملا جو ایک اجنبی آدمی کا تھا اسپر مہر جبلپور کی تھی مگر لکھنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا تھا نہ جہاں آرا کے خط سے خط ملتا تھا عبارت یہ تھی۔

فکرمند دولہا کو معلوم ہو کہ یہ دنیا عیش و آسایش اتنی جلدی نہیں دیتی جتنی انسان کو اسکی آرزو ہوتی ہے۔ جو چیز محنت و مشقت و تلاش کے بعد میسر آتی ہے آدمی اسی کو قدردانی سے عزیز رکھتا ہے اس امتحان کا کورس مستعدی سے پڑھو تمہاری چیز محفوظ ہے وہ تم کو ملیگی وہ چیز اپنی حفاظت اپنی شان کے موافق خود کرے گی اس کا اندیشہ نہ کرو، والسلام،

یہ خط دیکھکر نصرت نے اپنے والد سے اجازت مانگی اور سیدھا جبلپور پہنچا وہاں جاکر اس

نے سب سے پہلے اپنے ہدف وشکار مسز مسٹن کی تفتیش شروع کی مگر کہیں کچھ سراغ نہ ملا۔ یہ ڈاک بنگلے میں ٹھیرا ہوا تھا کہ ایک خانساماں نے رات کے وقت کسی شخص کا ایک کارڈ لاکر دیا جو اس سے ملنا چاہتا تھا۔ کارڈ پر مس روزی لکھا ہوا تھا۔ نصرت گھبراکر پلنگ سے اٹھ بیٹھا اور خانساماں سے کہا کرسی بچھادو اور مس صاحبہ کو اندر بلالو۔ نصرت نے مس روزی کو دیکھا نہ تھا مگر اس کے خیال میں وہ ایک چالیس سالہ عورت تھی لیکن جس وقت مس روزی اندر آئی تو اس نے دیکھا کہ سانولی صورت کی ایک سترہ سالہ لڑکی ہے جو پیروں سے لنگ کرتی ہوئی چلی آتی ہے نصرت کھڑا ہو گیا مصافحہ کرکے بٹھایا اور گھبراکر پوچھا آپ بمبئی سے کب آئیں مس روزی نے ہنسکر کہا میں بمبئی کبھی نہیں گئی میرا مکان اسی شہر میں ہے کل پادری صاحب سے میں نے آپ کی پریشانی کا حال سنا تھا اسلئے بطور اظہار ہمدردی آپ کے پاس آئی ہوں۔ نصرت نے شکریہ ادا کیا اور کہا کیا آپ مجکو میری اس مصیبت میں کچھ مدد دے سکتی ہیں۔ مس روزی بولی افسوس ہے کہ سوائے ہمدردی کے میں کچھ اور نہیں کرسکتی لیکن آپ ایک ایسی عورت کی تلاش کیوں کرتے ہیں جو بے اطلاع کے غائب ہوگئی اور جس کے چال چلن پر ان واقعات سے شبہ کرنے کا ہر شریف آدمی کو حق حاصل ہے۔ یہ کہہ کر مس روزی ایک موثر انداز سے مسکرائی نصرت مبہوت تھا کہ وہ کیا جواب دے اس کا نفس کچھ اور کہتا تھا اور دل کچھ اور۔ آخر کچھ دیر کے سکوت کے بعد نصرت نے دبی زبان سے کہا مس صاحبہ اس سلسلہ کو ختم کیجئے اب آپ کے آرام کا وقت ہوگا میں بھی تھکا ماندہ ہوں اپنا پتہ بتائے کل میں وہیں ملنے آؤنگا مس روزی بہت اچھا کہہ کر کھڑی ہوگئی اور گڈبائی کہہ کر جلدی سے باہر نکل گئی آدھی رات تک نصرت اسی خلجان میں مبتلا رہا کہ میں کس لئے آیا ہوں اور یہ کیا پیش آرہا ہے۔ دوسرے دن مس روزی کے بتائے ہوئے پتہ پر گیا وہاں ایک آیا دروازے پر ملی جس نے اُس کو خط دیا۔

نصرت حسن کو تم نے مس ذری سمجھا وہ تمہاری جوئی تھی تم میں ابھی خامی باقی ہے کیا تم جوئی کی تلاش میں آئے تھے اور مس ذری کو دیکھ کر اپنی جوئی کو بھول چلے تھے اس کی سزا یہ ہے کہ تین مہینے کی قید تنہائی میں رہو اب تم اس گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔

نصرت نے خط ختم کیا اور مڑ کر دیکھا تو دروازہ بند تھا۔ آیا نے کہا یہاں ہر قسم کا سامان تفریح موجود ہے۔ آپ یہاں رہئے میں خدمت میں حاضر ہوں، آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے کیا اپنے والدین کو بے پتہ خیریت نامہ لکھ دیجئے جس میں تحریر ہو کہ میں تین مہینے کے بعد آ جاؤں گا۔ اور جوئی میرے ساتھ آئیگی نصرت اور حیران ہوا کہ یہ میں کیا سن رہا ہوں اور جب باہر جانے کا راستہ نہ پایا تو مجبور ہو کر بیٹھ گیا اور اسی مکان میں رہنے لگا۔ تیسرے دن اس نے اپنے والدین کو خط بھی لکھ دیا۔ اس مکان میں سوائے آیا کے کوئی نہ تھا جو مکان سے باہر جاتی تھی مگر ضرورت کی سب چیزیں خود بخود مہیا ہو جاتی تھیں جب ایک مہینہ اس طرح سے گزر گیا تو ایک رات گھٹا چھائی ہوئی تھی بجلی چمک رہی تھی اور نصرت اپنے کمرہ میں پڑا سو رہا تھا کہ کسی نے اسکی چادر منہ سے ہٹائی اور اسکو ہوشیار کیا۔ نصرت نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو جوئی سامنے کھڑی تھی۔ نصرت اٹھ بیٹھا اور اس نے جوئی سے باتیں کرنی چاہیں مگر اس نے سوائے مسکرانے کے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ ڈیڑھ گھنٹہ جوئی نصرت کے پاس بیٹھی رہی اس کے بعد ایک سگار جلا کر نصرت کو دیا۔ نصرت نے سگار پینا شروع کیا اور اس پر نیند نے اتنا غلبہ کیا کہ وہ بیٹھے بیٹھے یکایک سو گیا آنکھ کھلی تو نہ وہ مکان تھا نہ آیا بلکہ نصرت کا اپنا گھر تھا اور سامنے جوئی بیٹھی ہوئی تھی۔ نصرت نے حیرت سے پوچھا اب تو بتا دو یہ کیا ماجرا ہے۔ جوئی بولی بتانے کی ضرورت نہیں اب تم اپنے گھر میں ہو اپنے والد اور تمہارے والدین کی پریشانیوں کو میں نے وجوہات گمشدگی بتا کر مطمئن کر دیا۔ اب ہم تم ہر طرح آزاد ہیں۔

زندگی

نصرت اور جوئی ہنسی اور خوشی سے رہنے لگے مگر جب کبھی نصرت اس راز کو معلوم کرنا چاہتا جوئی

اسکو ڈانٹ دیتی اور کبھی خبردار اسکو نہ پوچھتا۔ نصرت اس سے اتنا دبو بنتا تھا کہ زیادہ زبان نہ کھول سکتا تھا۔ جوئی کے پاس اس فیشن کی عورتیں برابر آتی جاتی رہتی تھیں اور وہ ان سے کھیلا کرتی تھی اور عموماً یہ تاش شرط لگا کر کھیلا جاتا تھا جس میں جوئی اکثر ہارتی تھی۔

جوئی کو بارہ ہزار روپیہ سالانہ والد بھیجتے تھے اور سو روپے مہینے کا نصرت نوکر تھا مگر فیشن کے کپڑوں۔ انگریزی زیورات اور جوئے بازی میں روپیہ اس بیدردی سے لٹتا تھا کہ کبھی ان میاں بیوی کا ہاتھ فراغت سے نہ رہا۔ بیوی کو دیکھ کر نصرت کو بھی جوئے کی لت لگی اور وہ کلب گھر میں جا کر جوا کھیلنے لگا اور اس کے بعد گھوڑ دوڑ کی شرطوں کا شوق ہوا۔ جس میں اس نے گھر کا تمام اثاثہ برباد کر دیا۔ اس اثنا میں اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنے گھر کا اکیلا خود مختار تھا مگر جوئی کا باپ خواص خاں زندہ تھا جو اپنی جائداد کی آمدنی جوئی کو ہر سال بھیجدیا کرتا تھا۔

نصرت سے کسی نے کہا خواص خاں کو اس جائداد میں بہت آمدنی ہے اور تم کو وہ بہت کم دیتا ہے یہ سن کر نصرت کو خیال ہوا کہ کسی طرح خواص خاں کا کام تمام کرنا چاہیئے تاکہ جاگیر پر قبضہ ہو۔ چنانچہ وہ ایک روز گاؤں میں گیا اور اپنے سسرے کا مہمان ہوا۔ رات کے وقت اس کے دودھ میں ایک ایسی دوا ڈالدی جس کو پی کر خواص خاں کو خون کے دست آنے لگے اور سات روز کے بعد اس کا کام تمام ہو گیا۔ خواص خاں کے مرنے کے بعد حسب قاعدہ نصرت اس جائداد کا منتظم مقرر ہوا مگر سال ہی بھر کے اندر جوئے کی بدولت یہ جائداد سود خوار بنیوں کے پاس چلی گئی۔ اب نصرت اور جوئی کی زندگی بہت عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ سو روپیہ میں گزارہ مشکل ہو گیا تھا۔ جوئی وہ مستعد اور بڑا اسرار جوئی نہیں رہی تھی۔ بلکہ نہایت کاہل وجود اور آرام طلب عورت تھی جس کو رات دن پڑے رہنے کے سوا کچھ کام نہ تھا اس کے ایک لڑکی تھی مگر اسکی خدمت بھی اس سے نہ ہو سکتی تھی غرض نصرت اور جوئی کی زندگی نہایت پریشانی اور عسرت کی زندگی تھی مگر کم بخت

جوئے کی عادت اب تک ان میں موجود تھی۔

مصائب

ایک روز صبح دفتر جانے سے پہلے نصرت جونی کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ باہر کسی نے آواز دی نصرت دروازہ سے نکلا تو دیکھا پولیس کا ایک افسر اور چند سپاہی کھڑے ہیں انہوں نے وارنٹ دکھا کر اس کو گرفتار کر لیا اور کوتوالی لے گئے جونی کو معلوم ہوا اس نے فوراً گاڑی منگائی اور ایک بیرسٹر کو لیکر کوتوالی پہنچی تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ نصرت پر خواص خاص کے قتل کا الزام ہے سال بھر کے بعد کسی نے مخبری کی ہے اور جہاں سے نصرت نے زہر لیا تھا وہاں یہ بھانڈا پھوٹا ہے اور ثبوت ہر طرح مکمل ہے مقدمہ شروع ہوا اور جونی نے اپنے زیور و کپڑے یہاں تک کہ مکان بھی فروخت کر کے مقدمے کی پیروی کی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا اور نصرت چودہ برس کے لئے جیلخانہ بھیجدیا گیا۔

اب جونی کا عالم تباہ تھا اس کے پاس ایک پیسہ باقی نہ تھا مشن کی مسیں جو اسکی دوست تھیں وہ مدت سے نہ آتی تھیں کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ جونی یوں تو ہر طرح آزاد ہے مگر اپنے مذہب اسلام میں بڑی پکی ہے اور عیسائی مذہب سے اسے سخت نفرت ہے۔

آخر جونی نے نوکری کرنے کی ٹھانی اور ایک ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاں ماماگیری کی نوکری کر لی۔ اس کو اپنی سابقہ زندگی یاد آتی تھی تو تلملا جاتی تھی مگر چونکہ تعلیم یافتہ تھی اس واسطے دل کو تسلی دے لیتی تھی۔

ایک دفعہ عید کا دن تھا ہیڈ ماسٹر کی بیوی اور بچے عید کا سامان کر رہے تھے جس نے لڑکی کہا جو اب تین برس کی ہو گئی تھی اماں ہم کو بھی نئے کپڑے پہناؤ تو اسکے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا اور بیساختہ اسکو گلے لگا کر خوب روئی ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیوی نے جو اسکو روتے دیکھا تو بہت برا بھلا کہا اور اپنے گھر سے نکال دیا اور بولی کہ ایسی عورت کا میرے گھر میں کام نہیں جو تہوار کے دن نسوے بہا کر بدشگونی کرے جونی اس گھر سے نکل کر لڑکی کا ہاتھ پکڑے بازار کے ایک رستے میں جا کر کھڑی ہوئی اس کو زمین و آسمان میں ایک اندھیر نظر آتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ

کل کیا تھا اور آج کیا ہو گیا اور اپنے گذشتہ اعمال پر نفریں کرتی تھی یہ سوچتے سوچتے وہ رستے کے ایک کنارے بیٹھ گئی عیدگاہ سے نمازی الٹے پھرے تو اسکو فقیر سمجھ کر کچھ دینا چاہا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا پھر سوچا کہ جب قدرت ہی کو منظور ہے تو پھر بھیک مانگنے میں کیا عیب ہے۔ اس نے پیسے لینے شروع کئے اور پھر تو اس کا یہ طریقہ ہو گیا ہے کہ دن بھر ایک قبرستان میں پڑی رہتی اور رات کو محلے میں بھیک مانگنے جاتی اور یہ صدا لگاتی۔

بھیک کی صدا

دولت والو ٹکڑا دو۔ عزت والو ٹکڑا دو۔ اپنے بچوں کا صدقہ دو۔ اپنے لالوں کا صدقہ ٹکڑا دو۔ تمہاری چوڑی کی خیر۔ تمہاری مہندی کی خیر۔ ایک نوالہ۔ لو میرا خالی پیالہ لو کو تمہارے منے میں ٹھوکریں کھانے والی بھکارن آئی ہے۔ ساتھ میں اسکی جائی ہے ہم دونوں پر بھوک کی مار آئی ہے۔ دوہائی ہے دوہائی ہے۔ ایک نوالہ مجھ کو دو

سونے والو جاگو۔ میں بھی ایک دن سوتی تھی۔ پیا کا ہیرا موتی تھی۔ دنیا نے تاراج کیا اس کو جس نے راج کیا۔ اب گدڑی میرا جوڑا ہے اور پاؤں کا چھالا گھوڑا ہے۔

عیش کی راتیں فانی ہیں۔ موج کے دن سب پانی ہیں۔ کنڈی کھولو ٹکڑا دو۔ ہاتھ بڑھاؤ ٹکڑا دو۔ روکھا ہو، باسی ہو، سب ہے نعمت۔ بھوک سے میری بری ہے نوبت۔ یہ ننھی بچی روتی ہے۔ یہ محل کی ملکہ گود میں تھی۔ اب گدا کی دختر بیدل ہے۔ یہ باپ کی پیاری۔ دکھ کی ماری۔ در در پھرے۔ دوارے آئی بھکاری ٹکڑا دو پیسہ دو۔

یہ دنیا آنی جانی ہے۔ ذرہ ذرہ فانی ہے۔ غفلت میں مدہوش نہ ہو۔ عبرت سے باہوش ہو۔ صدقے کا ایک ٹکڑا دو۔"

جوگی کی صدا سنکر محلہ میں تہلکہ مچ جاتا تھا۔ لوگ اس کا حال پوچھتے تھے۔ عورتیں اندر بلاتی تھیں۔ مگر یہ کسی کے پاس نہ جاتی تھی۔ بھیک لیکر وہیں قبرستان میں جا پڑتی تھی۔

جیل خانہ

جوئی مدت تک اس حال میں رہی۔ ایک دن قبرستان میں سانپ نے اسکی لڑکی کے کاٹا اور وہ غریب مرگئی اب جوئی کا حال غیر ہوا اور ایک دن اس نے جیل پہنچ جا کر داروغہ سے درخواست کی کہ میرے قیدی خاوند سے مجکو ملا دو۔ رحم دل جیلر نے ایک سپاہی کے ساتھ اسکو جیل کے اندر بھیجدیا شام ہوگئی تھی جوئی اندر گئی تو نصرت مشقت سے فارغ ہو کر تھکا ماندہ اپنی کوٹھڑی میں پڑا تھا جوئی کو دیکھ کر چیخ مار کر رونے لگا جوئی نے کہا ہراساں نہ ہو اپنی جوئی کو دیکھو جو ایک دن ذوقیہ خط لکھتی تھی دوسرے دن مس وزری تھی تیسرے دن تمہارے گھر کی شہزادی تھی جو بدن پہ چیتھڑے پہنے ہوئے بھکارن ہے مگر پیارے یہ انقلابات میرے اعمال کا خمیازہ ہیں نہ میں اتنی آزاد ہوتی نہ مجکو بری صحبت برباد کرتی ناقص مغربی تعلیم کی بدولت مجکو تمہارے امتحان کی ہوس ہوئی۔ یہ عجیب و غریب چتر تیرے اور تم کو آزمایا۔ آزاد خیالی۔ فیشن پرستی اور جوئے نے یہ نتیجہ دکھایا۔ مگر اب زندگی دشوار ہے سانس لینے سے جی بیزار ہے تم یہاں ایک سہارے سے تو ہو میں تو بالکل بےکس و لاچار ہوں آنکھوں کا تارا موت نے توڑ لیا۔ خوشی کا سہارا جیل نے چھین لیا اب جینا بے سود ہے۔ مرنے آئی ہوں مگر ذلیل مرنا نہیں مرونگی۔ دل کے ارمان نکال کے مرونگی۔ لاؤ اپنے ہاتھ بڑھاؤ میں ان میں پیاری ہتکڑی ڈالوں۔ نصرت نے متعجب ہو کر ہاتھ بڑھائے جوئی نے اپنے بالوں سے ان کو باندھ دیا اور مسکرا کر نصرت کو دیکھا۔ نصرت کو وہی لطف آیا جو جبلپور کے ڈاک بنگلہ اور جوئی کے ساتھ جیل خانے میں ایک رات اٹھایا تھا مگر نصرت کی مسرت ختم نہ ہوئی تھی کہ جوئی نے اپنے سینے میں ایک چاقو بھونک لیا اور جیل کی کوٹھڑی میں تڑپنے لگی۔ نصرت نے یہ عالم دیکھا تو اس نے بھی چاقو اپنے سینے میں مار لیا اور دونوں تڑپ تڑپ کر مر گئے مگر مرتے دم تک نصرت نے اپنی جوئی کے بالوں کو اپنے ہاتھ میں پیاری ہتکڑی بنائے رکھا۔

ناقص تعلیم مشن کی مسوں کی صحبت اور آزادی فضول خرچی اور جوئے بازی کا یہ انجام ہوتا ہے۔ دو اچھی زندگیاں کیسی نامراد اور ناشاد برباد ہوئیں۔

دہلی کی شہزادی کی کہانی

اماں! یہ مورت انہی وائسرانی کی ہے جنہوں نے ہم کو ایک ہزار روپئے دیئے ہیں؟

ہاں۔ بیٹی یہ بڑے لاٹ صاحب کی بیوی کا فوٹو ہے۔ بڑی رحمدل ہیں ہمیشہ غریبوں پر ترس کھایا کرتی ہیں۔ اب کے ہم بے سہاروں کا بھی خیال آگیا۔

ذرا اس تصویر کو مجھے دینا۔ میں ان بیگم کی بلائیں لوں، واری جاؤں اور دو باتیں کر کے جی کی بھڑاس نکالوں۔

بھولپن کی باتیں

میں صدقے! تم بڑی اچھی آدمی ہو۔ میں قربان کیا نورانی صورت ہے۔ مگر تم ہم غریبوں کے جھونپڑے میں کیونکر آئیں۔ ہمارے ہاں تو ٹوٹے بوریئے کا فرش بھی پورا نہیں ہے۔ میں تم کو کہاں بٹھاؤں ہم کو چارپائی بھی میسر نہیں۔ ہم سب زمین پر سوتے ہیں۔ یہ بہت ٹھنڈی ہے۔ تم کو نزلہ نہ ہو جائے۔ ہمارے مکان کی کڑیاں بھی جھکی ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو گر پڑیں۔ میں تمہاری کیا خاطر کروں۔ کیا چیز دسترخوان پر چنوں۔ پرسوں سے ہم نے کچھ نہیں کھایا۔ ابا میاں کو بنئے نے آٹا قرض نہیں دیا۔ اس وقت بھوک کے مارے میری عجیب حالت ہے۔ اگر گھر میں کچھ ہوتا تو میں سب تمہارے سامنے رکھ دیتی۔ میں بھوکی رہتی تم کو کھلاتی کیونکہ تم نے ہم پہ احسان کیا ہے اور اس وقت ہم کو یاد کیا ہے جبکہ سارا جہان ہم کو بھول گیا تھا۔

کیوں بیگم! تمہارا جی اس اندھیرے گھر میں گھبراتا تو نہیں۔ تم تو بجلی کی روشنیوں میں رہتی ہو۔ میں کیا کروں آج ہم کو مٹی کا چراغ بھی نصیب نہیں ورنہ اسی کو روشن کر دیتی۔

تم کو کہاں سلاؤں۔ رات کیونکر گذرے گی۔ ہمارے پاس فقط دو پھٹے ہوئے کمبل ہیں ایک ابا میاں اوڑھتے ہیں۔ ایک میں اماں مجھکو ساتھ لیکر سوتی ہیں۔

میرے پیارے لاٹ صاحب کی بیگم! ذرا میرے ہاتھوں اور منہ کو دیکھو۔ سردی سے پھٹ گئے ہیں۔ سردی کی راتیں پہاڑ ہو جاتی ہیں۔ سکھ نیند ہمارے خواب میں بھی نہیں آتی۔

تم نے ہم کو ہزار روپے دیئے ہیں ہزار بار اپنے ہاتھوں سے تمہاری چٹ چٹ بلائیں لوں اماں کہتی ہیں۔ ایک زمانہ ہمارا بھی تھا۔ ہم بھی ہزاروں لاکھوں روپے غریبوں محتاجوں کو بانٹا کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی اونی قالین اور مخملی فرش تھے۔ ریشمی اور زریں پردے تھے۔ سونے چاندی کی جڑاؤ چھتیں تھیں۔ شال دوشالے تھے۔ لونڈی غلام تھے۔ محل تھے ہندوستان کی شہنشاہی میں داخل تھے۔

ہمارے سامنے بھی گردنیں جھکتی تھیں۔ راجہ مہاراجہ اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ ہم بھی لاچاروں بے سہاروں پر ترس کھاتے تھے۔ دوسروں کی خاطر اپنا گھر لٹاتے تھے۔ ہمارے جلوس میں بھی نقارے بجتے تھے۔ نقیب پکارتے تھے۔ ہاتھی جھوم جھوم کر چلتے تھے۔ ہمارے سر پر بھی تاج تھا۔ تلواریں ہمارے قدموں پر بھی سر ٹیک کر جاتی تھیں۔ توپیں ہماری ہوں پر بھی گرج گرج کر برستی تھیں۔

لیکن بیگم! اب وہ وقت کہاں ہے۔ دنیا ڈھلتی پھرتی چھاں ہے۔

اونچے اونچے مکان تھے جنکے بڑے　　آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے　　نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے　　استخواں تک بھی ان کے خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے　　باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

خدا نے ہم کو نعمت دی۔ جبتک ہم اس کے قابل رہے نعمت پاس رہی اور جب ہمارے عمل خراب ہوئے۔ عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ ملک سے بے خبر ہو گئے۔ مظلوموں کو بھول گئے ظالموں کی چرب زبانیوں پر ریجھ گئے۔ خدا نے وہ دولت چھین لی اور دوسروں کو دیدی ہم کو اس میں کسی سے شکوہ نہیں۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

ہاں! تم میری ماں کی برابر بلکہ ان سے بھی بڑی ہو۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں یہاں بھی نہ بولوں تو کہاں زبان کھولوں۔ خدا نے تم کو ہم سب کا رکھوالا بنایا ہے۔ دیکھو تو بھوک پیاس ہم کو ستاتی ہے۔ ہمارے ایسے دن خاک میں ملاتی ہے۔ میری عمر ایسی تھی کہ چہرہ لال ہوتا مگر فاقوں نے زرد کر دیا ہے۔ ہمارے گھروں میں عید بقرعید کی خوشی بھی نہیں آتی ہم کو ان دنوں میں بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ ہم اس دن بھی ٹوٹی ہوئی جوتیاں اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس دن ساری دنیا اپنی اپنی حیثیت کے بموجب نئی جوتیاں اور نئے کپڑے پہنتی ہے۔ ہم کو برسات کے ٹپکے اور کھٹمل رات دن رلاتے ہیں ہم کو سردیاں جلانے آتی ہیں۔ ہم پر گرمیاں قیامت ڈھاتی ہیں۔

دلی شہر کے کتے پیٹ بھر کر سوتے ہیں، کوے شکم سیر ہو کر گھونسلوں میں جاتے ہیں چوہوں تک کے واسطے پکی چھتوں کے گھر ہیں۔ گلہریاں بھی شاندار مکانوں میں رہتی ہیں مگر تیمور بادشاہ کی اولاد۔ شاہجہاں بادشاہ کے بچے جنہوں نے اس شہر کو فتح کیا اور بنایا۔ آدھی روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہوئے بھوکے سوتے ہیں۔ ان کو کوئی رات بیفکری کی نصیب نہیں ہوتی۔ جن کے باپ دادا نے لال قلعہ بنایا تھا۔ ان کو ٹوٹا جھونپڑا بھی میسر نہیں آتا۔

بھکارن شہزادی

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر

بیگم! تم نے دیکھا ہوگا۔ دلی شہر میں ایک جامع مسجد ہے جس کو ہمارے دادا شاہ جہاں نے بنایا دور دور کی خلقت اسکو دیکھنے آتی ہے مگر اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پھٹے ہوئے برقع کے اندر رنا تواں بچہ کو گود میں لئے پیوند لگا پاجامہ اور گھسی ہوئی گٹھنے لگی جوتی پہنے کون عورت بھیک مانگتی ہے۔ بیگم یہ غریب دکھیا بیوہ شہزادی ہے جس کا کوئی وارث نہیں رہا۔ تم یقین کرنا میری رحم دل وائسرانی اسی کے باپ شاہ جہاں نے یہ مسجد بنائی تھی

آج پیٹ کے لئے یہ بھیک کے ٹکڑے جمع کر رہی ہے تاکہ زندگی کی مسجد آباد کرے مجھے شرم آتی ہے میں تم سے کیونکر کہوں کہ یہ ہزار روپے بہت تھوڑے ہیں مرہم کے ایک چھوٹے سے پھائے سے کیا ہوگا ہمارے تو سارے بدن پر زخم ہیں۔

تمہاری نئی دلی کی خبر جس کی سڑکوں میں لاکھوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ تمہاری نئی عمارتوں کی خبر جن کے واسطے کروڑوں روپے کی منظوری ہے۔ تمہارے اس نیک خیال کی خبر جس کی بدولت دلی کی پرانی عمارتوں کی مرمت ہو رہی ہے اور بے شمار روپیہ اس میں خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے پیٹ کی نامراد سڑکوں کی بھی مرمت کراؤ اور ہمارے ٹوٹے ہوئے دلوں پر بھی عمارتیں چنواؤ ہم بھی پرانے زمانے کی نشانیاں ہیں۔ ہم کو بھی زندہ آثار قدیم میں لوگ سمجھتے ہیں۔ ہم کو بھی سہارا دو مٹنے سے بچاؤ۔ خدا تم کو سہارا دیگا اور بچائیگا۔ یہ کہتے کہتے دکھیا شہزادی چونکی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ملا اور کہا میں بھی کیا دیوانی ہوں تصویر سے باتیں کرتی ہوں۔ کاغذی بت کے آگے مرادیں مانتی ہوں مگر شاید کسی خدا کے بندے کے کان تک یہ دیوانہ پن کی باتیں پہونچ جائیں اور وہ انگریزی میں ترجمہ کرکے خدا ترس لارڈ ہارڈنگ بیگم کو یہ سنا دے اور وہ اپنے خداوند لاٹ صاحب سے کہیں۔ کونسل کے ممبروں سے کہیں بادشاہ سلامت اور انکی ملکہ سے کہیں کہ آل شاہجہاں کی حفاظت کے لئے بھی نئی دلی کی دیگر منظوریوں کے ساتھ کوئی شاندار مصیبت شکن منظوری ہونی چاہئیے[1]۔

دکھیا شہزادی کی کہانی

جس ننھی شہزادی کا یہ خیالی قصہ لکھا گیا ہے اُن کی ماں پر غدر کے زمانہ میں بڑی بپتا پڑی تھی اس لئے وہ سچا اور اصلی قصہ بھی یہاں درج کیا جاتا ہے (وہ کہتی ہیں غدر میں میری عمر سات برس کی تھی) اماں مجھکو تین برس کا چھوڑ کر مر گئی تھیں۔ ابا کے پاس رہتی تھی۔ چودہ برس کا ایک میرا

اردو علوم عالم

[1] لیڈی ہارڈنگ نے جو مرگئیں اس تحریر پر توجہ کرکے غریب شہزادوں کی مدد کی تھی۔ حسن نظامی

جمشید شاہ نامی تھا مگر ہاتھ پاؤں کے اٹھان سے بیس برس کا معلوم ہوتا تھا۔ ابا جان نابینا ہوگئے تھے اور ہمیشہ گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ڈیوڑھی پر چار نوکر اور ایک داروغہ۔ گھر میں تین باندیاں اور ایک مغلانی کام کرتی تھیں۔ حضرت بہادر شاہ ہمارے رشتے کے دادا ہوتے تھے اور ہمارا سب خرچ شاہی خزانے سے ملتا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک بکری پلی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے اس کے بچے کو ستانا شروع کیا۔ بکری نے بگڑ کر میرے ٹکر ماردی میں نے غصے میں دست پناہ گرم کرکے بکری کے بچے کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ وہ بچہ تڑپ تڑپ کر مرگیا۔

کچھ دن بعد غدر پڑا۔ بادشاہ کے نکلنے کے بعد ہم بھی ابا کے ساتھ شہر سے نکلے۔ پالکی میں سوار تھے اور بھائی جمشید گھوڑے پر ساتھ ساتھ تھے۔ دلی دروازے سے نکلتے ہی فوج والوں نے پالکی پکڑ لی بھائی کو بھی گرفتار کرنا چاہا۔ انہوں نے تلوار چلائی۔ ایک افسر کو زخمی کیا۔ آخر زخموں سے چور ہوکر گرے سامنے وہ نوکر ارپھر پڑے تھے وہ آنکھوں میں چھپ گئے اور بھائی نے جنجھلا کر تھوڑی دیر میں جان دے دی۔ بھائی کی بے قرار آواز سن کر ابا میاں بھی پالکی سے نیچے اتر آئے اور ٹٹول ٹٹول کر لاش کے پاس گئے اور پتھر سے سر ٹکرا کر لہولہان کر لیا یہاں تک کہ ان کا بھی وہیں خاتمہ ہوگیا۔

اس کے بعد فوج والوں نے ہمارا سب سامان لے لیا اور مجھکو بھی پکڑ لیا میں چلتے وقت باپ اور بھائی کی لاش سے چمٹ کر خوب روئی اور ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر مجبوراً فوج کے ساتھ چلی گئی ایک دیسی سپاہی نے افسر سے مجھے مانگ لیا اور وہ اپنے گھر مجھکو لے گیا جو پٹیالے کی ریاست میں تھا۔

اس سپاہی کی بیوی بڑی بدمزاج تھی۔ وہ مجھ سے برتن منجھواتی۔ مسالہ پسواتی۔ جھاڑو دلواتی اور رات کو پاؤں دبواتی تھی۔

شروع شروع میں ایک رات دن بھر کی محنت سے تھک گئی تھی پاؤں دباتے میں اونگھ آگئی تو اس جلادنی نے دست پناہ گرم کرکے میری بھوؤں پر رکھ دیا جس سے پلکیں تک جھلس گئیں اور بھوؤں کی چربی نکل آئی میں نے ابا کو پکارنا شروع کیا کیونکہ مجھے اتنی سمجھ نہ تھی

کرنے کے بعد پھر کوئی نہیں آیا کرتا۔ جب اللہ نے جواب نہ دیا تو میں اس عورت کے ڈر کے مارے سہم کر چپ ہو گئی لیکن اس پر بھی اسکو ترس آیا اور بولی کہ پاؤں دبا۔ زخموں کی تکلیف میں مجھکو نیند نہ آتی تھی اور پیر بھی نہ دب سکتے تھے۔ مگر قہر درویش بر جان درویش میں نے اسی حالت میں پاؤں دبائے سویرے مسالہ پیسنے میں مرچوں کا ہاتھ زخموں کو لگ گیا اس وقت مجھکو تاب نہ رہی اور زمین پر مچھلی کی طرح تڑپنے لگی مگر بے رحم عورت کو تب بھی کچھ خیال نہ آیا اور بولی چل مکار کام سے دم چراتی ہے اور یہ کہکر پسی ہوئی مرچیں زخموں پر مل دیں اس وقت مجھکو مارے تکلیف کے غش آگیا اور رات تک ہوش نہ آیا صبح کو آنکھ کھلی تو بیچارہ سپاہی میرے زخموں کو صاف کرکے دوا لگا رہا تھا۔

تھوڑے دن کے بعد سپاہی کی یہ بیوی مر گئی اور اس نے نئی شادی کی جو مجھ پر بہت مہربان تھی اسی کے گھر میں میں جوان ہو گئی اور اس نے میری شادی ایک غریب آدمی سے کردی۔ دو برس تک میرا خاوند زندہ رہا۔ اس کے بعد مر گیا۔ بیوہ ہو کر میں دلی چلی آئی کیونکہ وہ سپاہی بھی مر گیا تھا اور اس کی بیوی نے دوسری شادی کر لی تھی۔ دلی میں آکر میں نے بھی اپنی قوم میں دوسری شادی کی جس سے فقط ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

اس خاوند کی پانچ روپے ماہوار انگریزی سرکار سے پنشن تھی مگر تنخواہ قرضے میں چلی گئی اور اب ہم نہایت عسرت اور تنگ دستی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

بھوکی بیگم کی کہانی

فروری ۱۹۱۵ء کی چھٹی تاریخ دلی کا کنجان محلہ آسمان پر ابر۔ بجلی کی کڑک چمک۔ ٹھنڈا ہوا کے جھونکے زمین پر کیچڑ۔ کم بخت چراغ ہی گل۔ اس گھر کے دروازے پر پھٹے ہوئے ٹاٹ کا پردہ تھا اندر ایک چھوٹا سا دالان اس میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ایک بیگم اپنے تین بچوں کو چمٹائے ہوئے لحاف میں دبکائے بیٹھی تھیں۔

بجلی چمکتی تو چھوٹا بچہ ڈر کر ماں سے چمٹ جاتا۔ دو لڑکیاں بڑی تھیں۔ ایک دس برس کی ایک کوئی سات برس کی۔ چھوٹا لڑکا پانچویں سال میں تھا۔

بڑی لڑکی بولی۔ کیوں اماں ہم کب تک گاجریں اور شکر قندیاں کھائیں گے۔ روٹی کو جی ترس گیا۔ ماں نے جواب دیا بیٹی شکر کرو۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے۔ کہ وہ گاجریں اور شکر قندیاں تو دیدیتا ہے۔ ہزاروں بیچارے ایسے ہونگے جن کو یہ بھی میسر نہ ہونگی۔

چھوٹی نے کہا واہ پڑوس میں جو خاں صاحب رہتے ہیں۔ ان کے بچے روز سویرے حلوا پوری کھاتے ہیں۔ پھر نہاری روٹی آتی ہے وہ کھاتے ہیں۔ پھر جلیبی والے سے جلیبیاں خریدتے ہیں۔ تیسرے پہر کچالو والا آتا ہے وہ انھیں خوب کھلاتا ہے۔ تم نورروز گاجروں کو ابال کر شکر ڈالتی ہو۔ یا چٹنی سے کھاتی ہو۔ خاں صاحب کے ہاں گھر بھیت پکتا ہے۔ اور دودھ کھانڈ ڈال کر کھایا جاتا ہے۔ آج بھی شام کو اُن کے ہاں کوفتے اور پسندے پکے تھے۔

ماں کے دل پر معصوم بچی کے کہنے کا اثر تو بہت ہوا۔ مگر اس نے دل کو سنبھال کر کہا بیٹی ایک خاں صاحب ایسے ہو گئے۔ سارے محلے والے ایسے تھوڑی ہیں۔ مہنگے سمے ہیں سب کے ہاں گاجریں اور شکر قندیاں کھائی جاتی ہیں۔ جب سستا سماں تھا اور تمہارے اباجان زندہ تھے تو تمہیں یاد نہیں اپنی آپا سے پوچھو۔ ہمارے ہاں بھی سب کچھ پکتا تھا۔ اور تمہاری آپا روز حلوا پوری۔ اور کچالو کھایا کرتی تھیں۔ اب دیکھو کل ٹوپی والا آئے گا اور ہماری مزدوری دے گا۔ تو روٹی پکائیں گے۔

بڑی نے کہا۔ کیوں اماں اس کے پاس کتنے دام ہیں۔ بیگم بولیں سوا سات آنے میرے حساب سے۔ مگر وہ کہتا تھا۔ کہ مندے کے سبب اب ٹوپیوں کی کڑھائی کم ہو گئی ہے۔ باہر کے بیوپاری جو سردی میں مال خریدنے آتے تھے نہیں آئے۔ اس واسطے تمہاری مزدوری بھی وہ نہیں ملے گی جو ہمیشہ ملتی تھی۔ خیر اگر اس نے کم بھی دیا تب بھی پانچ چھ آنے تو آئینگے بس اس میں باجرے کی گرم گرم روٹی اور شلجم کی جھٹ پٹی بھجیا پکائیں گے۔ خوب جی بھر کر کھانا۔ چھوٹی نے کہا گجک دگزک بھی منگوانا۔ اب کے موسم میں تو ہم نے زبان پر نہیں رکھی لڑکا بولا اور میں بسکٹ بھی لاؤں گا۔

صبح

رات کو اس بھوکے کنبے نے آرام سے بسر کی۔ صبح ہوئی۔ تو لڑکے کے سینے اور پسلی میں درد تھا۔ شدت سے بخار چڑھا ہوا تھا۔ بیگم بہت گھبرائیں بارش ہو رہی تھی پیسہ پاس نہ تھا لڑکی کو پڑوس میں بھیجا۔ اور تھوڑی سی آگ منگائی خاں صاحب کی بیوی نے کہا

ہوا سویرے ہی سویرے آگ لینے چلی آئیں۔ میرا بچہ پردیس میں گیا ہوا ہے۔ مجھے رحم آتا ہے۔ کہیں اور سے لے آؤ میں آگ نہیں دینے کی۔

لڑکی نے آکر ماں سے کہا۔ وہ ٹھنڈا سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔ اور بچے کو کوٹھری میں لے جا کر لٹا دیا۔ نیچے لحاف بچھا دیا۔ اور چارپائی کا بان جلا کر چیٹیاں جلائیں مگر وہ بھیگ گئی تھیں آگ کا اثر نہیں ہوا۔ اور بان جل کر رہ گیا۔ ناچار غریب نے اپنے بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔ اور رونا شروع کیا۔ دونوں معصوم بچیاں پاس بیٹھی ماں کے منہ کو تکتی تھیں روتے ہیں بیگم بولیں۔

الٰہی مجھ پر رحم کر۔ یہ بن باپ کے بچے ہیں تین دن سے انہوں نے روٹی کی صورت نہیں دیکھی اس بے زبان کو تندرستی دے۔ میں دوا کہاں سے لاؤں۔ پیٹ کو تو ملتا نہیں۔

ابھی بیگم کے آنسو نہ تھمے تھے کہ بارش زور کی ہونے لگی۔ اور پاخانے کی دیوار گر پڑی۔ دیوار کی آواز سے دونوں لڑکیاں بھی اماں اماں کہہ کر ماں کو لپٹ گئیں۔

اس وقت عجب عالم تھا۔ بیگم کبھی گھر کو دیکھتی تھی۔ جہاں ایک زمانے میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اور آج ایک صندوق کے سوا جس میں پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ کبھی یہ خیال کرتی تھی۔ کہ شوہر قبر میں سو جاتے ہے۔ انہیں کیا خبر کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ آج کوئی ان سے کہتا۔ کہ تمہاری چاہیتی بیگم کو کوئی آگ بھی نہیں دیتا۔ تمہارا لال بخار میں پڑا بلبلا رہا ہے۔ ایک پیسے کی بنفشہ تک نصیب نہیں جو گرم کر کے اس کے حلق میں ڈالوں۔ کیا آج کے دن کے لئے مجھ کو پالکی میں سوار کر کے لائے تھے؟ کیا ارمانوں بھرا سہرا اسی دن کے لئے باندھا تھا۔

دنیا دیوانی ہے۔ جو چار دن کی خوشی کو شادی کہتی ہے۔ یہ شادیاں نہیں ہیں۔ آدمیوں کی بربادیاں ہیں۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ کہ میرے ہاتھوں کی مہندی کو تمہارے ابا جب آنکھوں سے لگاتے تھے۔ اور بار بار ہونٹوں پر رکھتے تھے۔ تو میرا دل کہتا تھا۔ کہ آج میں سارے جہان کی ملکہ ہوں۔ اگرچہ ساس نندیں تو جب بھی نہ تھیں لیکن یہ محلے والے ہی ان کے وقت میں ایسی خاطریں کرتے تھے۔ جس کی حد نہیں۔ کیونکہ میں ایک تھانے دار کی بیوی تھی۔ اور خاوند میرے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔

آدمی خوشی میں مغرور و بے خبر ہو جاتا ہے۔ اور برے وقت کا دل میں دھیان بھی نہیں لاتا۔ اگر اس وقت مجھے اس مصیبت کا خیال آجاتا۔ تو کچھ جمع پونجی کا سوجھتا کر لیتی جب تو جو آیا۔ خوب کھایا اڑایا۔ اب وقت پڑا تو پچھلا وقت پیر تنفر بن کر ستاتا ہے۔ جس سے یہ اڑا وقت کٹنا دوبھر ہو جاتا ہے۔

قصہ مختصر دوپہر تک بارش کا یہی عالم رہا۔ پاخانہ سارا گر پڑا۔ دالان ٹپکنے لگا۔ ایک

کوٹھڑی بچی ہوئی تھی۔ جس کے اندر یہ برباد ملکہ بیٹھی تھی۔

لڑکا تو خیر بیمار تھا۔ لڑکیوں نے کھانے کو مانگا۔ مہینہ کے سبب دروازے پر گاجر والا بھی نہ آیا تھا۔ اس نے کہا بس اب ذرا مہینہ ختم ہو جائے تو تم کو سودا منگا دیں گے لڑکیاں چپکی ہو گئیں۔

لڑکے کا بخار بڑھتا جاتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا۔ بھوک۔ گرم کپڑا نا پید نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مغرب کے وقت بیکس یتیم کا آخر وقت آیا۔ گردن کا منکا ڈھلا۔ اور بیگم کی پانچ برس کی کمائی اس کی گود میں موت نے لوٹ لی۔

ذرا خیال کرنا۔ آسمان پر وہ گھٹا نہیں ہے۔ جس کو دیکھ کر کبھی بیگم کے دل میں امنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ بلکہ غم کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہے مینہ برس رہا ہے۔ ہوا کا وہی عالم ہے۔ محلے والے سب چپ چاپ ہیں۔ حالانکہ یہ وقت بچوں کے غل شور کا ہوا کرتا ہے۔ بارش اور سردی نے سب کے حواس گم کر رکھے ہیں۔

بیگم پر وقت بہت نازک تھا۔ مگر نہ اس کی زبان سے ہائے نکلی نہ آنکھ سے آنسو بہے نونہال کی لاش کو سینے لگائے سناٹے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اور سوچتی تھی کہ اب کیا کروں۔

آخر پھر مجبور ہو کر بڑی لڑکی کو پڑوس میں بھیجا۔ کہ ننھے بھائی جنت کو سدھائے گھر میں چراغ تک نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنی لالٹین دیدو۔

ہمسائی کو ترس آ گیا۔ اس نے فوراً لالٹین روشن کر کے دیدی۔ مگر خود نہ آ سکی کیونکہ اس کے بچے کے گلے میں گنڈا تھا۔ اپنے خاوند کو مسجد کے ملاں کے پاس بھیجا۔ کہ اپنی بیوی کو بیگم کے پاس بھیجدے۔ رات کی رات وہ اس کے پاس رہیں۔ صبح دفن کا سامان ہو جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ملانی صاحبہ آئیں۔ اور گھر میں بیٹھنے کا ٹھکانا نہ دیکھ کر بڑائی ہوئی الٹے قدم پھریں۔ بیگم نے کہا۔ بیگم نے کہا۔ دیکھنا تم کو بڑا ثواب ہو گا۔ آج کی رات تھوڑی سی تکلیف ہی اٹھاؤ۔ دیکھو ہم اکیلے ہیں۔ بچے کی لاش پڑی ہے۔ کوئی تو بات کرنے والا ہو۔ لڑکیاں سو جائیں گی۔ تو میں اکیلی کیونکر رات کاٹوں گی۔

ملانی صاحبہ نونہال کے مردوں کا ساتھ دیتی تھیں۔ اس سردی اور کیچڑ میں یہ سمجھ کر آ گئی تھیں کہ کوئی کھاتا پیتا گھر ہو گا۔ کپڑے اور کھانے ملیں گے۔ یہاں آ کر نقشہ دوسرا ہی نظر آیا۔ اس لئے بولیں۔ بیوی مجھے خود سانس اکھڑنے کی بیماری ہے یہاں بیٹھوں کہاں۔ سردی کا اثر ہو گیا تو میری جانوں کے لالے پڑ جائیں گے۔ مولوی صاحب کو تو ابھی سے دوسری

شادی کی ہوس ہے۔ میں زیادہ بیمار پڑ گئی تو کرہی لینگے۔ رات تو جس طرح بن پڑے گزار لو۔ کل صبح ہی میں آجاؤں گی۔ یہ کہہ۔ اور دروازے سے نکل۔ یہ جا وہ جا۔

بچیاں سو گئیں۔ بیگم کے سامنے لالٹین ہے۔ آس پاس لڑکیاں ہیں۔ گود میں بجھا ہوا چراغ ہے۔ جو پانچ برس تک اس گھر کو اُجالا دیتا رہا۔ دو وقت سے غریب کو گاجریں بھی میسر نہیں آئیں۔ اس پر کفن دفن کا فکر سوار ہے۔ اور دل سے یہ باتیں کر رہی ہے دیکھئے اب صبح کو کیا ہوگا۔ میں نے تو آج تک تھانے دار کی عزت کو بچایا یا خود تکلیفیں اٹھائیں بچوں کو تکلیفیں دیں۔ مگر اس مرحوم کی غیرت کو قائم رکھا۔ محلے کی عورتوں نے ہرچند کہا کہ حاجی بخش الٰہی نے آٹے کی دکان کھلوا دی ہے۔ وہاں دس سیر کا آٹا ملتا ہے۔ مگر میری غیرت نے گوارا نہ کیا۔ کہ تھانے دار کی بیوہ کے نام سے چٹھی منگاتی۔ فقر و فاقہ منظور مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ بازار والے تھانے دار کی بیگم کو اتنا غریب سمجھیں۔ کہ خیرات کا آٹا اس کے نام تولیں۔

خواب میں رسول خدا کی زیارت

اسی دردناک حالت میں غریب بیگم کی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ پہاڑ پر سے ایک دریائی چادر نیچے گر رہی ہے۔ اور اس چادر کے اوپر ایک تخت بچھا ہوا ہے۔ تخت کے پائے کو پکڑے ہوئے اس کا خاوند تھانے دار کھڑا ہے اور تخت نشین کے چہرے پر نقاب ہے۔ بیگم نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ دیکھا تو رانجھے کو گود میں لے بیٹھا ہے تو ٹھٹک گئی۔ تھانے دار نے جواب دیا تھوڑی دیر اور لئے رہو۔ ذرا حضرت رسول خدا سے باتیں کر لوں تو لوں گا۔

بیگم کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سننے سے بڑا جوش پیدا ہوا وہ آگے بڑھی۔ تخت پہ اپنے سر کو رکھ دیا۔ اور کہنا شروع کیا۔ میرے رسول اللہ۔ میرے والی وارث کیا آپ بھی مجھ کو بھول گئے۔ دیکھئے میں آپ کی امت ہوں۔ خدا سے کہہ کر اس قحط سالی کو دور کرا دیجئے۔ سب سے زیادہ آپ کی امت کے لوگ پریشان ہیں۔ اور میرے اس بچے کو زندہ کر دیجئے۔ میری زندگی کا تو یہی سہارا تھا۔

حضرت نے دریا کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا یا تو دریا کی چادر پہاڑ سے نیچے زمین پر گر رہی تھی اور دریا الٹا اپنی زمین سے پہاڑ کی جانب پانی چڑھنے لگا۔ اور آپ کا تخت پہاڑ کی چوٹی پر چلا۔ بیگم اور اس کا خاوند بھی پہاڑ پر تخت کے ساتھ چلے۔ اوپر جا کر ایک بلند درخت کی شاخوں میں سرخ رنگ کا ایک سیب لٹکا ہوا تھا۔ اور اس پر سبز رنگ میں کچھ عبارت

مرقوم تھی۔ حضرت نے اشارہ کیا۔ اس کو پڑھو۔ بیگم نے عرض کی۔ میں ان پڑھ ہوں۔ تھانے دار نے پڑھکر سنایا۔

لکھا تھا "خدا کی حکمت کو بندے کی ناقص عقل نہیں جانتی۔ خدا ہر تکلیف کے بعد راحت بھیجتا ہے۔ جو سیدھی گنگا بہاتا ہے۔ اس کو الٹی گنگا بہانے پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اپنے اعمال کو یاد کرو۔ جن کے خمیازے میں یہ تکلیفیں بھیجی جاتی ہیں۔

بیگم یاد کر! جب تیرا گھر آباد تھا۔ اور تو فراشی اٹے میں رہتی تھی تو تیرے پڑوس میں ایک ہندو بیوہ کا گھر تھا۔ جس کے پانچ چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ ایک دن اس کا ایک بچہ فاقے کی حالت میں تیرے گھر میں آگیا۔ تو اس وقت اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھی ڈال کر زردہ کھا رہی تھی۔ تجھ کو خدا نے اس وقت تک اولاد نہ دی تھی۔ تیرے دل نے دنیا کی کسی تکلیف کو نہ سمجھا تھا۔ اس لئے تو نے اس معصوم یتیم کو دھکا کر گھر سے نکال دیا۔ تجھ کو نظر لگ جانے کا وہم ہوا تھا۔ ہندو بیوہ نے جب اپنے فاقہ زدہ بچے کی نسبت تیری دشنام دہی سنی تو اس کے کلیجے سے ایک آہ نکلی۔ اور اس نے اس کو پکارا جس کو تو پکارتی ہے۔ محمد صلعم دونوں کے سفارشی ہیں۔ جب ہندو بیوہ نے اے بھگوان مجھ پر دیا کر کہا تو محمد صلعم کی روح نے آمین کی آواز دی۔ خدا نے اس کو قبول کیا۔ بیوہ کو غیب کے خزانے سے نعمت دی گئی۔ اور تجھ کو ذلیل کر دیا گیا۔ اب اگر تو سچے دل سے توبہ کرے تو تیرے دن بھی پھر جائیں گے۔ اور ان لڑکیوں کی شادیاں ایسی جگہ ہونگی۔ کہ پھر تیری کوئی مشکل اڑی نہ رہے گی۔ اب لڑکے کی موت پر صبر کر۔ یہ تقدیر کا لکھا پورا ہو چکا۔

بیگم جاگی۔ تو اس کا جی مطمئن تھا۔ خواب نے اس کے سامنے آیندہ کے شاندار زمانے کو جما رکھا تھا۔ صبح ہوئی تو اس کے پڑوسیوں نے اس کے بچے کو اول منزل پہنچایا مگر یہ آج تک اپنے خواب کی تعبیر کے یقین میں مگن ہے۔

جگ بیتی کہانیاں ختم ہوئیں

بیٹے خواجہ بانو کی محنت کا شکریہ کہ انہوں نے اخبارات و رسائل سے میری کہانیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ اور ان کا ایک جداگانہ مجموعہ تیار کر دیا۔ میں نے اس کا نام جگ بیتی کہانیاں رکھا ہے۔ کیونکہ ان کہانیوں میں اکثر سچی اور وہ ہیں جو لوگوں پر گذری ہیں۔ میں نے واقعات کو اپنے رنگ سے ذرا رنگین کر دیا ہے۔

حسن نظامی دہلوی

حجرہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی دہلی | فروری ۱۹۱۷ء